پاکٹ ایڈیشن، پتہ سید ذکی احمد نیڑھی گھاٹ، پٹنہ سٹی،

رضی احمد صاحب نے اپنی فطری مناسبت کی وجہ سے ایک مدت سے شعر و سخن کو اپنا مشغلہ بنا رکھا ہے، وہ زیادہ تر غزلیں کہتے ہیں، اس مجموعہ میں ان کی سو مختصر غزلیں اور چند قطعات ہیں، انھوں نے کسی استاد سے اصلاح نہیں لی ہے، مگر اس کے باوجود ان کی غزلوں میں تغزل کی لفظی و معنوی خوبیاں موجود ہیں، کہیں کہیں الفاظ معانی کا ساتھ ضرور چھوڑ دیتے ہیں، مگر ان کی کوئی غزل روانی، برجستگی، معنویت اور کسی حد تک درد و سوز سے خالی نہیں ہے، اب تک ان کی شاعری زیادہ تر ان کے مخصوص احباب کے دائرہ میں محدود تھی، اب انھوں نے کشت خیال کے ذریعہ عام اہل ذوق سے داد تحسین حاصل کرنے کی کوشش کی ہے، امید ہے کہ اس میں وہ ضرور کامیاب ہوں گے۔

خروشِ جرس - از علامہ محمد اسحاق فاروقی رونق صفحات ۳۱۲، کتابت و طباعت عمدہ، ناشر ملک دین محمد اینڈ سنسز، بل روڈ، لاہور، قیمت ؏

خروشِ جرس، رونق صاحب کا مجموعۂ کلام ہے۔ اس مجموعہ میں ان کی غزلیں بھی ہیں اور نظمیں بھی، ان کو شاعری پر قدرت ہے، اس لیے وہ دونوں اصناف کا حق ادا کرتے ہیں، ان کے کلام میں روانی، سلاست اور معنویت ہوتی ہے، اس لیے پڑھنے والے کو ان کے کلام سے اکتاہٹ نہیں پیدا ہوتی، رونق صاحب کہنہ مشق شاعر ہیں، مگر ان کے کلام میں گیرائی، گہرائی اور عشق و محبت کے جذبات کی قدرے کمی معلوم ہوتی ہے، اس لیے اردو شعراء کے صفِ اول میں ان کو مشکل سے جگہ مل سکتی ہے۔ تاہم ان کا کلام مطالعہ کے لائق ہے۔

"م۔ ج"

جلد نمبر ۹۵ - ماہ صفر المظفر ۱۳۸۵ھ مطابق ماہ جون ۱۹۶۵ء - نمبر ۶

مضامین

شذرات

مسلم یونیورسٹی کے ہنگامے پر ذاتی مشاہدہ کی بنا پر گذشتہ مہینہ معارف میں اظہار خیال کیا جا چکا ہے، اس واقعہ کی جس قدر بھی مذمت کیجائے کم ہے، اس نے مسلم یونیورسٹی کی روایات کو داغدار کر دیا، لیکن یہ کوئی نیا اور عجیب واقعہ نہیں ہے، ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں آئے دن اس قسم کے ہنگامے ہوتے رہتے ہیں، لیکن کسی نے ان کو اتنی اہمیت نہیں دی جتنی مسلم یونیورسٹی کے ہنگامے کو دیجا رہی ہے، اور نہ حکومت کا اتنا عتاب کسی یونیورسٹی پر نازل ہوا، واقعہ یہ ہے کہ مسلم یونیورسٹی عرصہ سے ایک طبقہ کی نگاہ میں کھٹک رہی ہے، اور وہ اس کے خلاف برابر زہر اگلتا اور اس کو طرح طرح کے الزاموں کا نشانہ بناتا رہا ہے۔ اب اس کو اپنے منصوبے پورا کرنے کا موقع مل گیا، لیکن اس کا مقصد ہی مسلمانوں کو نقصان پہنچانا ہو، اس لیئے اس کا شکوہ نہیں، حیرت حکومت کے طرز عمل پر ہے کہ وہ ایک ایسے واقعہ پر جو یونیورسٹیوں میں برابر ہوتا رہتا ہے، مسلم یونیورسٹی کی بنیاد ہی ڈھانے کے لیے آمادہ ہے، اور یہ کار خیر ایک مسلمان وزیر کے ہاتھوں انجام پایا ہے،

اس سلسلہ میں اصل سوال یہ ہے کہ ہندوستان کے دستور کی رو سے یہاں کی تمام اقلیتوں کو اپنی ضرورت اور مرضی کے مطابق اپنے قومی و ملی ادارے قائم کرنے کا حق ہے، مسلم یونیورسٹی بھی اسی قسم کا ادارہ ہے، وہ محض درسگاہ نہیں، بلکہ اسلامی تہذیب و ثقافت کا مرکز بھی ہے، اس کے قیام کا مقصد ہی یہ ہے کہ اس میں مسلمانوں کو ان کی تہذیبی روایات

کے مطابق تعلیم دیجائے، اس کے لیے اس کا کردار اور اس کی فضا اسلامی اور اس میں مسلمانوں کی اکثریت اور ان کا اقتدار ہونا ضروری ہے، ایسی حالت میں حکومت کو ان خصوصیات کے مٹانے کا کس طرح حق ہے، وہ ان کی خرابیوں کی اصلاح تو کر سکتی ہے، لیکن اس کی خصوصیات اور روایات کو نہیں مٹا سکتی۔

سیکلرزم اور وسیع تر قومیت کے نام سے یونیورسٹی کے اسلامی کردار کو مٹانے کا جواز نہیں نکل سکتا، سیکلرزم کا تعلق صرف حکومت سے ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ حکومت کسی مذہب اور فرقہ کی نمایندہ نہیں ہے، اس کی نگاہ میں سارے مذاہب اور فرقے برابر ہیں، وہ مذہب کی بنا پر کسی میں کوئی فرق و امتیاز نہیں کرتی۔ اسکے دستور میں سب کے حقوق یکساں، اور سب کو یکساں ترقی کے مواقع حاصل ہیں، اس مفہوم کے اعتبار سے ہر چیز میں سیکلرزم کو گھسیٹنا کہاں تک صحیح ہے، حکومت کے علاوہ اور جہاں بھی اس کا استعمال کیا جائے گا، اس کے معنی اس کے سوا کچھ نہیں ہیں کہ کسی مذہب اور فرقے کے ساتھ تعصب نہ کیا جائے، سب کے ساتھ رواداری برتی جائے، اسی طرح قومیت کا مفہوم یہ ہے کہ ملک کے تمام باشندوں کا ملکی و وطنی مفاد مشترک ہے، اور ہندوستان سے متعلق ان کے حقوق و فرائض یکساں ہیں، یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ اپنی انفرادی اور ملی خصوصیات مٹا کر ایک ہی رنگ میں رنگ جائیں اور من و تو کا امتیاز باقی نہ رہے، اس اعتبار سے بلاشبہ مسلمان بھی ہندوستانی قومیت کا ایک جز ہیں، اور ہندوستان سے متعلق ان کے وہی فرائض اور وہی ذمہ داریاں ہیں جو دوسرے باشندوں پر ہیں،

اس لیے مسلم یونیورسٹی کی سیکلرزم اور قوم پروری کا مقصد صرف یہ ہے کہ اس کے دروازے کسی فرقہ پر بند نہ ہوں اور اختلاف مذہب کی بنا پر کسی کے ساتھ امتیازی سلوک نہ کیا جائے، اس کے طلبہ میں وطن کی خدمت اور محبت کا جذبہ پیدا کیا جائے اور اس میں ان کا قدم کسی سے پیچھے نہ رہے، یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ مسلم یونیورسٹی کے اسلامی کردار کو مٹا دیا جائے، یہ سیکلرزم نہیں خالص فرقہ پروری ہے، قوم پروری اور وطن دوستی کے لحاظ سے بھی مسلم یونیورسٹی کی تاریخ بڑی روشن ہے، اس کے مخالفین کی نظر اس پر تو جاتی ہے کہ لیگ اور کانگریس کی کشمکش کے زمانہ میں یہاں کے طلبہ کی ایک جماعت نے لیگ میں حصہ لیا تھا، لیکن اس پر نہیں جاتی کہ نان کوآپریشن کی تحریک میں جب ہندو یونیورسٹی نے کسی قوم پرور لیڈر کو اپنے پاس پھٹکنے نہیں دیا تھا، مسلم یونیورسٹی کے طلبہ نے مولانا محمد علی کی سرگردگی میں مسلم یونیورسٹی کے بالمقابل ایک قومی یونیورسٹی قائم کردی، وہ مسلم یونیورسٹی ہے جس نے مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، ڈاکٹر انصاری، ڈاکٹر سید محمود، رفیع احمد قدوائی، عبدالمجید خواجہ تصدق احمد خان شیروانی اور ڈاکٹر ذاکر حسین جیسے قوم پرور پیدا کیے، آج بھی مسلم یونیورسٹی کی فراخ دلی کا یہ حال ہے کہ اس میں ایک تہائی سے زیادہ غیر مسلم طلبہ ہیں، اور پالیٹکنک انجینیرنگ اور ڈاکٹری میں ان کی اکثریت ہے، اسٹاف میں بھی غیر مسلم اساتذہ کی خاصی تعداد ہے، پھر بھی وہ فرقہ پروری کی مجرم ہے، لیکن اگر دوسری یونیورسٹیاں تعصب اور تنگ نظری کا گڑھ بھی ہوں تو بھی قابل اعتراض نہیں۔

یہ مسئلہ تنہا مسلم یونیورسٹی کا نہیں بلکہ ایک دستوری حق کا ہے، اسی صوبہ میں ہندو یونیورسٹی بھی ہے، جو ہندو تہذیب و ثقافت کا مرکز ہے اور اس کو ان کا مرکز رہنا چاہیئے، ان دونوں

کی خصوصیات کو قائم رکھنا ہی سیکلرزم ہے، جو لوگ مسلم یونیورسٹی کو سیکلر بنانے کے جواز میں ہندو یونیورسٹی کو سیکلر بنانے کا دعوی کرتے ہیں وہ خواب و خیال کی دنیا میں ہیں، اگر انھوں نے اس کی جرأت کی تو ان کی وزارت کی خیر نہیں، "یہ علی گڑھ نہیں بنارس ہے"۔ لیکن بالفرض اس کو سیکلر بنانے کی کوشش بھی کی جائے تو اس کا معاملہ تو "خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گلِ کوزہ" کا ہے، اس میں اکثریت و اقتدار ہر حال میں اس کی قوم ہی کا رہے گا، جس کا کوئی طبقہ بھی قومی حمیت اور اپنی تہذیب کے احیاء کے جذبہ سے خالی نہیں ہے۔ اس لیے اس کے کردار و خصوصیات کو کسی حال میں بھی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔

ہندوستان کی ہر چیز نرالی ہے۔ سیکلرزم جن لوگوں کی ایجاد ہے، ان کا خود عمل یہ ہے کہ نہ صرف ان کی یونیورسٹیوں میں اسلامیات کے شعبے قائم ہیں، بلکہ ان کے یہاں اسلامیات کی تحقیقات کے مستقل ادارے ہیں، جن میں اسلامی آثار کو بھی ظاہر کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، اور ایک ہندوستان کی سیکلرزم ہے کہ پہلے عثمانیہ یونیورسٹی سے اردو زبان اور اسلامیات کو ختم کرکے سیکلر بنایا گیا، اب مسلم یونیورسٹی کا نمبر ہے۔

مسلم یونیورسٹی ہندوستان کے مسلمانوں کی بہت بڑی متاع اور ان کا سرچشمۂ حیات ہے، اس کی روح کو ختم کرنے کے معنی یہ ہیں کہ ان کی شہ رگ کاٹ دی گئی جس کو مسلمان کسی حالت میں بھی انگیز نہیں کرسکتے، وہ بڑے بڑے مصائب جھیل لے گئے، لیکن مسلم یونیورسٹی کے معاملہ میں سارے مسلمان تلملا اٹھے ہیں، جس کا اندازہ ان کے متحدہ اور مسلسل احتجاج سے کیا جاسکتا ہے، اگر حکومت اپنے ارادہ پر قائم رہی اور اس کے

دستور میں کوئی ایسی تبدیلی کی جس سے اس کی خصوصیات یا اس کی آزادی کو نقصان پہنچا تو مسلمان ہر قیمت پر اس کو بچانے کی کوشش کریں گے، اور عجب نہیں کہ اس سے ان کی زندگی کا رخ بدل جائے، جو قومی یکجہتی کے لیے انتہائی مضر ہے۔

مسلم یونیورسٹی حکومت کی سیکلرزم کا بھی بہت بڑا نشان ہے، چنانچہ اسلامی ملکوں کی جو بڑی شخصیتیں بھی ہندوستان آتی ہیں، ان کو یونیورسٹی ضرور دکھائی جاتی ہے، اگر اس کو بدلا گیا تو سیکلرزم کا ایک بڑا نشان مٹ جائے گا، اور پوری اسلامی دنیا میں اس کی بدنامی ہوگی۔ اس لیے یونیورسٹی کے دستور میں کوئی بنیادی تبدیلی کرنا ہر حیثیت سے حکومت کے لیے مضر ہے، اب تک جو کچھ ہوا اس کی تلافی کی شکل یہی ہے کہ آرڈیننس کو واپس لیا جائے اور یونیورسٹی کے ہنگامہ کی آزادانہ تحقیقات کے بعد قانونی کارروائی کیجائے، اس واقعہ کو آڑ بنا کر یونیورسٹی کو مسخ نہ کیا جائے۔ یہ وائس چانسلر صاحب کے امتحان کا بھی وقت ہے، کہ وہ یونیورسٹی کے اسلامی کردار کو کہاں تک قائم رکھتے ہیں۔

افسوس ہے کہ گذشتہ مہینے مولانا بدرالدین صاحب علوی سابق استاد عربی مسلم یونیورسٹی نے وفات پائی۔ مرحوم استاد العلما، مولانا لطف اللہ صاحب علی گڈھی کے تلمیذ رشید اور مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی مرحوم کے ہمدرس تھے، انکی پوری زندگی درس و تدریس اور علم و ادب کی خدمت میں گذری، مسلم یونیورسٹی سے ریٹائر ہونے کے بعد گھر پر عربی کے شائقین کو درس دیتے تھے، انھوں نے عرصہ ہوا المختار من شعر بشار بن برد اور اسکی شرح لابی الطاہر اسمٰعیل بن احمد التجیبی کو بڑے اہتمام سے تصحیح و تحشیہ کے ساتھ شائع کیا۔ اللہ تعالیٰ اس شیدائے علم کی مغفرت فرمائے۔

مقالات

مسلم علم الہیئت کا اجمالی جائزہ[1]

از جناب شبیر احمد خاں صاحب غوری ایم اے ایل ایل بی رجسٹرار امتحانات عربی و فارسی اتر پردیش

مسلمانوں میں علم ہیئت کا آغاز مسلمانوں میں نجوم و ہیئت کی باقاعدہ ابتدا دوسرے عباسی خلیفہ ابو جعفر منصور (۱۳۶ھ - ۱۵۸ھ) سے ہوئی، وہ پہلا خلیفہ ہے جس نے منجمین کو تقرب بخشا، اس کا منجم خصوصی نوبخت تھا، نوبخت کے علاوہ دربار کے ہیئت دانوں میں دو اور مشہور شخص تھے: محمد بن ابراہیم الفزاری اور یعقوب بن طارق۔ ان کے علاوہ ایک اور مشہور نجومی بھی تھا جس کا نام ماشاء اللہ تھا، نوبخت اور ماشاء اللہ ہی نے بغداد کی بنیاد ڈالنے کی مہورت نکالی تھی۔ ۱۵۶ھ میں (اور بقول البیرونی ۱۵۴ھ میں) ہندوستان کا ایک علمی وفد "برہم سدھانت" کا نسخہ لیکر منصور کے دربار میں حاضر ہوا، جسے اس کے حکم سے محمد بن ابراہیم الفزاری اور یعقوب بن طارق نے عربی میں منتقل کیا۔ یہی ترجمہ بعد میں "السند ہند الکبیر" کے نام سے مشہور ہوا۔

منصور کے بعد مہدی (۱۵۸ھ - ۱۶۹ھ) خلیفہ ہوا، اس نے بھی نجوم و ہیئت کی سرپرستی جاری رکھی۔ اس کا منجم خصوصی تھوفیل بن توما الرہادی تھا۔

مہدی کے بعد پہلے ہادی اور پھر ہارون (... - ۱۹۳ھ) خلیفہ ہوا، ہارون کا عہد برامکہ

---

[1] یہ مقالہ دار المصنفین کی جبلی کے لیے لکھا گیا تھا۔

کی علمی سرپرستیوں کے لیے مشہور ہے، انہی کے ایما سے سلمائے حرانی اور ابو سلمان نے بطلیموس کی کتاب المجسطی کا عربی میں ترجمہ کیا، انہی کے زمانہ میں عہد اسلام کی پہلی رصدگاہ شہر جندی سابور میں قائم ہوئی۔ اس کا متولی احمد النہاوندی تھا، جس نے اپنے فلکی مشاہدات کو "الزیج المشتمل" میں قلمبند کیا۔

ہارون کے بعد پہلے امین تخت نشین ہوا، مگر کچھ دن بعد چھوٹے بھائی مامون سے لڑ بیٹھا اور اسی خانہ جنگی کے نتیجہ میں تخت و تاج کے ساتھ جان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا۔

مامون اور اس کے جانشین امین کے بعد مامون (۱۹۸ھ - ۲۱۸ھ) سریر آرائے خلافت ہوا، وہ بالطبع عقلیت کا دلدادہ تھا، اور قیام خراسان کے زمانہ ہی میں فضل بن سہل کے زیر اثر نجوم اور جوتش کا معتقد ہو چکا تھا، اس نے یونانی علوم کے نشر و اشاعت پر خاص طور سے توجہ کی اور اس تحریک کو منظم طور سے چلانے کے لیے ہارون کے "خزانۃ الحکمہ" کی "بیت الحکمہ" کے نام سے تجدید کی، علم الہیئت کی ترقی کے سلسلے میں اس نے بغداد اور دمشق کے اندر رصدگاہیں قائم کرائیں، اس کی سرپرستی میں آلاتِ رصدیہ میں قابل قدر اصلاح ہوئی اور ان کی مدد سے اسکے ہیئت دانوں نے آفتاب کے "میل کلی" (Ecliptic City) خروج مرکز (Eccentricity) اور "نقطۂ اوج" (Apogee) کو متعین کیا لیکن ان سب سے اہم کارنامہ محیط ارضی کی پیمائش ہے، اس سے پہلے صرف یونانی حکیم ایراٹوستھینس نے شہر اسکندریہ میں تخمینی طور پر اسکا اندازہ لگایا تھا، لیکن مامون نے اصلاح شدہ آلات اور ماہرین ہیئت کی مدد سے تحقیقی طور پر دریافت کرایا۔

عہد مامونی کے منجمین میں یحییٰ بن ابی منصور، خالد بن عبد الملک المروزی، عباس بن سعید الجوہری اور سند بن علی زیادہ مشہور ہوئے لیکن ان سے بھی زیادہ مشہور محمد بن موسیٰ الخوارزمی (بانی علم الجبر و المقابلہ) ہے، اس نے محمد بن ابراہیم الفزاری کے "السند ہند الکبیر" کو مختصر کر کے "المجسطی" اور "زیج شہریار" کی مدد سے اس ہیئتی نظام کی بنیاد ڈالی جو "السند ہند" کہلاتا ہے اور مسلم علم الہیئت کی اصل سمجھا جاتا ہے، اس نئے نظام میں اس نے "اوساط کواکب" کے باب میں "سدھانت" کا تقلید، "تعدیلات" کے باب میں "زیج شہریار" کا اور "میل آفتاب" کے باب میں "المجسطی" کا اتباع کیا اور عرصہ تک لوگ خوارزمی ہی کی زیج پر اعتماد کرتے تھے۔

مامون کے بعد معتصم (۲۱۸ھ - ۲۲۷ھ) پھر واثق اور اس کے بعد متوکل (۲۳۲ھ - ۲۴۷ھ) خلیفہ ہوئے۔ اس زمانہ کے مشہور ہیئت داں حبش الحاسب، الکندی اور بنو موسیٰ ہیں۔

حبش الحاسب اجرام فلکی کی گردش کے حساب میں ید طولیٰ رکھتا تھا۔ وہ "الزیج الممتحن" کا مصنف ہے، اس کے علاوہ اس نے "زیج السند ہند" کی بھی اصلاح کی اور "جدول الدقائق" کے نام سے ایک "مثلثاتی جدول" بھی مرتب کی تھی، جس میں "اوتار" (Chords) کے بجائے "جیوب" (Sines) پر عمل کیا ہے۔

الکندی دنیا کے بارہ عبقریوں میں سے ایک ہے، اس نے ریاضی و ہیئت پر سو کے قریب کتابیں لکھیں اور "متوسطات" (وہ کتابیں جو اصول اقلیدس اور المجسطی کے درمیان پڑھائی جاتی ہیں) میں سے بعض کتابوں کا ترجمہ کیا تھا، اس کی ایک نجی رصدگاہ بھی تھی، جہاں وہ اجرام فلکی اور مظاہر جو کا مشاہدہ کیا کرتا تھا۔ ۲۲۲ھ کے اس قسم کے ایک مشاہدے کو اس نے ایک مستقل رسالہ میں قلمبند کیا تھا، کندی عام حکما کے برخلاف عناصر کو تین مانتا تھا، اور آگ کے بذاتہ عنصر ہونے کا منکر تھا۔

بنو موسیٰ نے سامرا میں ایک رصدگاہ قائم کی تھی جو رصدگاہ مامونی کے بعد اسلامی تاریخ کی دوسری مشہور رصدگاہ ہے، وہاں انھوں نے آفتاب کے "میل کلی" کے علاوہ سال شمسی

کی مدت کو بھی دریافت کیا تھا اور اسی دریافت کی بنیاد پر "کتاب سنۃ الشمس" لکھی تھی۔ عام ہیئت دانوں کے برخلاف بنو موسیٰ نو کے بجائے آٹھ آسمان مانتے تھے۔

متوکل کو اس کے بیٹے منتصر کے ایما سے ترکوں نے قتل کر دیا، اس کے بعد خلفاء کا عزل و نصب ترکوں کے ہاتھ میں آگیا، مگر جب ۲۵۶ھ میں معتمد خلیفہ ہوا، تو اس کے بھائی الموفق نے بڑی حد تک حالات پر قابو پالیا، معتمد کی وفات پر اس کا بھتیجا معتضد (۲۷۹ھ۔ ۲۸۹ھ) خلیفہ ہوا، اس نے اپنے حسن تدبیر سے خلافت کے گرتے ہوئے وقار کو سنبھال لیا۔ اس زمانہ کے مشہور ہیئت داں ثابت بن قرۃ الحرانی، ابومعشر البلخی، النیریزی اور البتانی ہیں۔

ثابت بن قرہ نے "المجسطی" کا از سر نو ترجمہ کیا اور بعض مقالات کی شروح لکھیں۔ اس نے فلکیاتی مشاہدات پر بھی کئی کتابیں لکھیں، اور تاؤن الاسکندرانی سے جو کوتاہیاں ہوئی تھیں، ان کی اصلاح کی۔ (Trepidation) کا مفروضہ بھی اسی کی طرف منسوب ہے، "علم المثلثات الکرویہ" پر "کتاب فی الشکل الملقب بالقطاع" لکھی جو اس موضوع کی امہات کتب میں محسوب ہوتی ہے۔

ابومعشر البلخی نجوم میں الکندی کا شاگرد تھا۔ وہ اس فن میں متعدد کتابوں کا مصنف ہے، اس نے ایران اور ہندوستان کے نجومی لٹریچر سے بہت زیادہ استفادہ کیا تھا۔ وہ قدیم نجوم کی تاریخ کا مستند ماہر سمجھا جاتا ہے۔

ابوالعباس النیریزی نے "المجسطی" کی شرح کے علاوہ "السند ہند" کے انداز پر بھی ایک زیج مرتب کی تھی، اس کے علاوہ ایک اور زیج (زیج معتضدی) معتضد باللہ کے نام پر معنون کی تھی جو البیرونی کے زمانہ تک اپنے فن کی معتمد علیہ تصنیف محسوب ہوتی تھی، اس نے علم المثلثات الکرویہ میں "شکل قطاع" کے بارے میں بھی تحقیقات کی تھیں۔

البتانی کا دنیا کے منتخب روزگار ہیئت دانوں میں شمار ہوتا ہے، قاضی صاعد اندلسی نے لکھا ہے کہ میں تاریخ اسلام میں کسی ایسے شخص کو نہیں جانتا جو ارصاد کواکب کی تصحیح اور ان کی حرکات کے امتحان میں اس کے مرتبہ کو پہنچا ہو، البتانی نے ۲۶۴ھ سے ۳۰۶ھ تک مشاہدات کیے۔ رویت ہلال، میل کلی، مدت سال، اختلافات قمری، کسوف و خسوف اور اختلاف المناظر کے حسابات کو اس نے بعد کے ہیئت دانوں سے زیادہ صحت و دقت نظر سے بیان کیا ہے، البتانی نے "اوتار" کے بجائے "جیوب" کو استعمال کیا اور مثلثاتی نسبتوں کو مقبول بنایا۔

اس عہد کے دیگر مشاہیر ماہرین علم ہیئت میں محمد بن علی نیشاپوری، الماہانی، محمد بن احمد ابن یوسف السمرقندی، سلیمان بن عصمہ اور ابوحنیفہ الدینوری قابل ذکر ہیں۔

محمد بن علی نیشاپور کی مشہور رصدگاہ کا متولی تھا، جسے طاہری خاندان کے امیر طاہر بن عبداللہ نے قائم کرایا تھا، ابن یونس نے اس رصدگاہ کی ایک دریافت کا حوالہ دیا ہے، یہ ۲۳۶ھ میں "استوار خریفی" کے وقت کا تعین تھا، جو ۲۸ ربیع الاول کو دوپہر کے وقت واقع ہوا تھا۔

الماہانی ہندسہ کے ساتھ ہیئت میں بھی دستگاہ رکھتا تھا، ابن یونس نے اس کے فلکی مشاہدات کا ذکر کیا ہے، جو اس نے ۲۳۹ھ سے ۲۵۲ھ ہجری تک کیے تھے۔

محمد بن احمد بن یوسف السمرقندی رصدگاہ سمرقند کا متولی تھا، جہاں حسب تصریح ابن یونس اس نے ۲۵۱ھ میں "وسط شمس" کی تحقیق کی تھی۔

سلیمان بن عصمہ بلخ کی رصدگاہ کا متولی تھا، جہاں اس نے ۱۶۵۶ سکندری (مطابق ۲۵۲ھ) میں فلکی مشاہدات کر کے ان کو "زیج النیرین" میں مدون کیا تھا، اس نے علم المثلثات میں "ساحۃ ذوات الزاحی" کے نام سے ایک رسالہ بھی لکھا تھا، اور ایک رسالہ (اس نے یا شاید ابوجعفر الخازن نے) ان مسائل پر بھی تحریر کیا تھا، جو "حل تعدیلات" میں کام آتے ہیں۔

ابوحنیفہ الدینوری: اپنے عہد کا بڑا فاضل تھا۔ ادب، مذہبیات، حساب اور ہندسہ وغیرہ میں دستگاہ کامل رکھتا تھا، وہ عربوں کے دیسی علم النجوم کا ماہر خصوصی تھا اور اس موضوع پر اس کی کتاب الانوا" بقول عبدالرحمٰن الصوفی بڑی مستند سمجھی جاتی تھی، اس کی رصدگاہ اصفہان میں تھی، جہاں اگلی صدی میں عبدالرحمٰن الصوفی نے بویہی وزیر ابن العمید کی معیت میں اسے دیکھا تھا۔

معتضد باللہ کے جانشینوں کے زمانہ میں حکومت کا ضعف و اختلال بڑھتا ہی گیا، یہاں تک کہ ۳۳۴ھ میں عراق میں آل بویہ کا اقتدار قائم ہوگیا، اور خلفاء کی حیثیت محض وظیفہ خواروں کی سی رہ گئی۔ لیکن اس عہد زوال میں ایک مشہور ہیئت داں خاندان کی ہیئتی سرگرمیوں کا تذکرہ ملتا ہے، یہ خاندان بنو اماجور کا تھا، جنھوں نے ۳۰۲ھ سے ۳۲۱ھ تک فلکیاتی مشاہدات کیے تھے، اور انھیں اپنی زیج میں قلمبند کیا، جس کا نام "بدیع" تھا۔

قرامطہ اور نجوم و ہیئت کی ترقی

خلافت کے ضعف و اختلال میں سب سے زیادہ حصہ قرمطی یا باطنی تحریک نے لیا، جس نے نصف صدی تک پوری اسلامی دنیا میں اپنے ظلم و ستم اور قتل و غارت سے تہلکہ ڈال دیا تھا، بایں ہمہ اس کی وجہ سے فلسفہ و حکمت کو عموماً اور نجوم و ہیئت کو خصوصاً غیر معمولی ترقی ہوئی جس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

باطنیت ایک خفیہ تحریک تھی، جو اسلام کی بیخ کنی اور ایرانی سلطنت کے بحال کرنے کے لیے وجود میں آئی تھی، مگر اس میں اور بھی اسلام کے مخالف عناصر مثلاً یہود، صابئہ حران، اور فلاسفہ بھی شامل ہوگئے تھے، اس لیے شروع ہی سے باطنیوں کا رجحان فلسفہ و حکمت کی طرف تھا، اس طرح ان کی آئیڈیالوجی فلسفیانہ بنیادوں پر استوار ہوتی رہی، چنانچہ اس تحریک کے اولین بانی عبداللہ بن میمون القداح، محمد بن الحسین زیدان، حمدان قرمط اور

ابوسعید الجنابی وغیرہم فلسفہ اور نجوم کے ماہر تھے۔

لیکن نجوم و ہیئت کے ساتھ باطنیوں کے غیر معمولی شغف کا سبب یہ افواہیں تھیں کہ استاذوں کی پیشین گوئی کے مطابق اب (تیسری صدی ہجری کے خاتمہ پر) مسلمانوں کا دین اور عربوں کی حکومت ختم ہونے والے ہیں، اور ان کی جگہ ایرانی سلطنت اور مجوسی مذہب بحال ہوں گے۔ مجوسیت پسند نجومیوں نے اس پیشین گوئی کے پورا ہونے کا وقت تیسری صدی کا اختتام بتایا تھا، اور یہی وہ وقت ہے جب معتضد کے نالائق جانشینوں کے زیر حکمرانی عباسی خلافت دم توڑ رہی تھی، اس لیے اسلام بیزار حلقوں میں اس کا بڑی بے چینی سے انتظار کیا جا رہا تھا، پہلے محمد بن الحسین زیدان کو اپنے متعلق مغالطہ رہا کہ وہ اس انقلاب کو بروئے کار لائے گا، اس کے مرنے پر ابوسعید الجنابی اس خوش فہمی کا شکار ہوا، مگر ۱۵۰۰ زردشتی گزر بھی گیا اور یہ پیشین گوئی نہ پوری ہونا تھی نہ پوری ہوئی۔

ان پیہم مایوسیوں کے دو ہی نتیجے ہو سکتے تھے، یا تو احکام نجوم کی اصابت سے یقین اٹھ جائے، یا ان مسلسل تکذیبوں کو نجومی حساب کی غلطی کا نتیجہ سمجھا جائے، چنانچہ ایران کی نجوم پرست طبیعت نے اسے نجومی حساب کی غلطی ہی پر محمول کیا، اور ہیئتی مشاہدات و حسابات میں صحت اور دقت نظر کی ضرورت کا احساس بڑھنے لگا۔ اور اسی احساس نے چوتھی صدی ہجری کو اسلامی علم ہیئت کا عہد زرین بنا دیا۔

اسلامی ہیئت کا عہد زرین چوتھی صدی

چوتھی صدی کے سیاسی انتشار نے ایک بغداد کے متعدد "بغداد" بنا دیے تھے، اور ہر "بغداد" نجوم و ہیئت کی سرپرستی میں سرگرم کار تھا:

۱۔ سامانیہ خراسان (۲۵۹ھ – ۳۸۹ھ) اس دربار کے مشاہیر فضلائے ریاضی و ہیئت میں ابوجعفر الخازن اور محمد بن عبدالعزیز الہاشمی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

ابوجعفر الخازن (زمانہ قریب ۳۴۲ھ) "الزیج الصفائح" کا مصنف تھا، جو علم ہیئت کی مشہور اور اہم کتابوں میں شمار ہوتی تھی، اس نے "المجسطی" کی شرح بھی لکھی تھی، اور علم المثلثات الکرویہ میں "شکل قطاع" کے بارے میں بھی تحقیقات کی تھی، ممکن ہے حل تعدیلات پر بھی رسالہ لکھا ہو۔

محمد بن عبد العزیز الہاشمی نے "زیج خوارزمی کی تعلیل" لکھی تھی۔

۲- بویہیہ فارس - آل بویہ تین بھائی تھے، بڑا بھائی عماد الدولہ فارس میں تھا، اس نے مرتے وقت (۳۳۸ھ) اپنے بھتیجے عضد الدولہ کو اپنا جانشین بنایا، عضد الدولہ ۳۶۶ھ میں باپ کی وفات کے بعد بغداد پر بھی قابض ہوگیا، جہاں ۳۷۲ھ میں راہی ملک بقا ہوا۔ وہ نجوم میں عبد الرحمن الصوفی اور ابن الاعلم کا شاگرد تھا، اس کے دربار کے مشہور ہیئت داں حسب ذیل تھے۔

کوشیار بن لبان: "زیج بالغ" "زیج جامع" اور "مجمل الاصول" کا مصنف ہے۔ علم المثلثات الکرویہ میں وہ پہلا شخص ہے جس نے شکل مغنی کو اس نام سے موسوم کیا۔

احمد بن عبد الجلیل السجزی - مسلمانوں میں پہلا شخص ہے جو بطلیموس کے ارض مرکزی نظریہ کے بالمقابل گردش ارضی کا قائل ہوا، اسی اصول پر اس نے اپنا "اصطرلاب زورقی" بنایا تھا، علم المثلثات الکرویہ میں اس نے شکل قطاع پر ایک مستقل کتاب لکھی تھی۔

شریف ابن الاعلم: عضد الدولہ کا منجم خصوصی تھا، وہ اسی کے کہنے کے مطابق کام کرتا تھا اس کی زیج ابن القفطی (بلکہ قاضی زادہ رومی شارح چغمینی) کے زمانہ تک اس فن کا شاہکار سمجھی جاتی تھی۔

عبد الرحمن الصوفی (المتوفی ۳۷۶ھ) "صور الکواکب" کا مصنف ہے، جو آج بھی علم الثوابت کی مہمات کتب میں شمار ہوتی ہے۔

۳- بویہیہ بغداد - عضد الدولہ کے بعد پہلے اس کا بیٹا صمصام الدولہ اور پھر دوسرا شرف الدولہ

تخت نشین ہوئے، شرف الدولہ نے ۳۷۸ھ میں کواکب سبعہ کی سیر و گردش کا مشاہدہ کرنے کے لیے رصدگاہ ماموی کے انداز پر بغداد میں ایک اور رصدگاہ بنوائی۔ رصدبندی کا کام ختم ہونے پر دو محضر تیار کرائے گئے جن پر ہیئت دانوں کے علاوہ اعیان دربار نے بھی دستخط ثبت کیے تھے، مشہور ہیئت داں حسب ذیل تھے۔

ابوسہل ویجن بن رستم الکوہی: شرف الدولہ کی رصدگاہ کا منتظم اعلیٰ تھا، علم ہیئت کے علاوہ وہ آلات رصدیہ کی تیاری سے بھی واقف تھا،

ابوحامد الصاغانی: شرف الدولہ کی رصدگاہ میں جو آلات استعمال کیے گئے تھے ان میں سے اکثر ابوحامد صاغانی ہی کے بنائے ہوئے تھے، اس نے ربع مشرقی کی مدت دریافت کرکے اس کا ثبوت دیا تھا کہ اوج شمس متحرک رہتا ہے۔

ابوالوفا البوزجانی (المتوفی ۳۸۸ھ) علم ہیئت میں دنیا کے مشاہیر فضلا میں شمار ہوتا ہے، قمر کے "اختلاف ثالث" کی دریافت جس کا شرف ٹیکو براہے کو دیا جاتا ہے، درحقیقت ابوالوفا ہی کا کارنامہ ہے۔ علم المثلثات الکرویہ میں وہ متفقہ طور پر "شکل ظلی" کا موجد ہے، اور شاید "شکل مغنی" (Sine Theorem) بھی اسی کی دریافت ہے۔

۴- بویہیہ رے: رے کا پہلا بویہی تاجدار رکن الدولہ تھا، اس کے بعد اس کے بیٹوں میں خانہ جنگی ہوتی رہی تاآنکہ عضد الدولہ کی وفات پر فخر الدولہ یہاں کا بادشاہ ہوا، ہیئت و نجوم کی سرپرستی میں رے کا دربار بھی دوسرے درباروں سے پیچھے نہ تھا۔ اس کے مشہور ہیئت داں یہ ہیں:

ابن العمید: پہلے بویہی تاجدار رکن الدولہ کا وزیر تھا۔ مختلف علوم کے ساتھ علم الہیئت میں بھی کمال رکھتا تھا، حسب تصریح البیرونی اس نے آفتاب کا "میل کلی" دریافت کرنے کی کوشش کی تھی۔

ابو محمود الخجندی: فخرالدولہ کے دربار کا سب سے مشہور ہیئت دان تھا۔ اس نے "سدس فخری" نام کا ایک Sextant بنا کر فخرالدولہ کے نام پر معنون کیا تھا۔ علم المثلثات الکرویہ کے سلسلے میں اس نے امیر ابو نصر بن عراق کی کوششوں سے واقف ہوئے بغیر "شکل مغنی" کو دریافت کیا تھا، اور اس کا نام "قانون الہیئۃ" رکھا تھا۔

۵۔ بویہیہ اصفہان: فخرالدولہ کی بیوی سیدہ نے اصفہان کی حکومت اپنے ماموں زاد بھائی ابو جعفر کاکویہ کو دیدی تھی، جو بڑا متعصب شعوبی تھا۔ اس میلان کی بنا پر شیخ بوعلی سینا جو اسمٰعیلی تحریک کا خاموش مگر سرگرم کارکن تھا، اس کے دربار میں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔

شیخ بوعلی سینا فلسفہ اور طب کے علاوہ ہیئت میں بھی کمال رکھتا تھا، کتاب الشفا کے جزو ہیئت میں "اختلاف منظر" کی بحث میں اس نے دس شکلوں کا اضافہ کیا اور اس فن میں ایسی چیزیں بڑھائیں جن کا اس سے پہلے کسی کو خیال بھی نہیں آیا تھا۔ علاء الدولہ کے ایما سے اس نے اپنے شاگرد ابو عبیدہ جوزجانی کے زیر اہتمام ایک رصدگاہ بھی قائم کی جس کے ذریعہ بہت سے نئے انکشافات کیے، مگر کثرت اسفار کی وجہ سے رصدگاہ جلد جلد ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتی رہتی تھی، اس لیے خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی۔ اس نے طول البلد دریافت کرنے کا ایک طریقہ بھی معلوم کیا تھا۔

۶۔ شاہانِ خوارزم: اس وقت خوارزم کے دو حصے تھے، مشرقی حصہ میں قدیم شاہی خاندان جو اس زمانہ میں آل عراق کہلاتا تھا، حکمراں تھا، مغربی حصہ کے حکمراں امونی کہلاتے تھے، مگر بعد میں وہ لوگ مشرقی حصہ پر بھی قابض ہو گئے اور یہاں کے فضلا جرجانیہ (مغربی خوارزم) ہی میں چلے گئے۔ ان میں دو فاضل بہت زیادہ مشہور ہیں:

امیر ابو نصر بن عراق، آل عراق کا شاہزادہ تھا۔ وہ مہندسین و منجمینِ اسلام میں امتیازی

حیثیت رکھتا ہے۔ ابو نصر بن عراق البیرونی کا استاد تھا جس کے لیے اس نے متعدد کتابیں لکھی تھیں۔ مگر اس کا مشہور کارنامہ "اکر مانالاؤس" کی اصلاح ہے۔ علم المثلثات الکرویہ میں اس کا سب سے درخشاں دریافت "شکل مغنی" ہے، جو عہد حاضر میں Sine Theorem کہلاتی ہے، ہیئت میں اس نے "المجسطی الشاہی" تصنیف کی تھی اور ابو جعفر الخازن کی "زیج الصفائح" کی تصحیح بھی لکھی تھی۔

ابو ریحان البیرونی: مسلمان ہیئت دانوں میں جو شہرت البیرونی کو نصیب ہوئی شاید ہی کسی دوسرے کو ہوئی ہو۔ "کتاب الہند" کے علاوہ جو نویں دسویں صدی مسیحی کے ہندوستان کی مذہبی و معاشرتی اور علمی و فکری تاریخ کا واحد ماخذ ہے، وہ "قانون مسعودی" اور "کتاب التفہیم" کا بھی مصنف ہے، ان کے علاوہ بھی اس نے متعدد کتابیں لکھی تھیں۔ البیرونی کی "قانون مسعودی" اسلامی علم الہیئت کا نمایندہ شاہکار ہے۔

البیرونی جوانی میں عبد الجلیل السجزی کے اصطرلاب سے متاثر ہو کر گردش ارضی کے نظریہ کی جانب میلان رکھتا تھا، مگر بعد میں اپنے استاد ابو نصر بن عراق کے رسالہ "النعی الفلکیہ" کو پڑھ کر پھر ارض مرکزی نظریہ کی جانب رجوع کر لیا، جیسا کہ "قانون مسعودی" سے ظاہر ہوتا ہے۔

البیرونی ہی نے ہندوستان کی تاریخ میں سائنٹفک علم الہیئت کا آغاز کیا، اس نے یہاں کے بہت سے شہروں کا طول البلد اور عرض البلد دریافت کیا۔ لیکن سب سے زیادہ اہم محیط ارضی کی پیمائش ہے، جو سرزمین ہند میں اپنی نوعیت کا پہلا اور دنیا میں تیسرا تجربہ تھا۔ (دوسرا تجربہ مامون الرشید نے کرایا تھا)

۷۔ اسمٰعیلیہ مصر: مصر کے اسماعیلی خلفا، بالطبع فلسفہ و حکمت بالخصوص نجوم و ہیئت کے دلدادہ تھے، چنانچہ العزیز باللہ کے ایما سے ابن یونس نے فلکیاتی مشاہدات کرنا شروع کیے اور اس کے بیٹے الحاکم بامر اللہ کے عہد میں انھیں ختم کر کے "الزیج الکبیر الحاکمی" کے نام سے مدون کیا

جو دنیا کی مشہور ترین زیجوں میں سے ہے۔

اسی زمانہ میں مصر کا دوسرا مشہور ہیئت داں ابن الہیثم تھا۔ اس نے ہیئت اور اعمال رصد پر بھی متعدد کتابیں لکھیں مگر وہ علم المناظرہ کے لیے زیادہ مشہور رہے۔

۸۔ اندلس بھی علم و حکمت اور نجوم و ہیئت کی سرپرستی میں پیچھے نہیں رہا۔ یہاں کے فضلائے ہیئت میں سب سے جلیل القدر مسلمہ بن احمد المرجیطی تھا، جو بقول قاضی صاعد اندلسی اپنے وقت میں اندلس کے ریاضی دانوں کا امام اور فلکیات میں سرآمد فضلائے روزگار تھا۔ اس نے البتانی کی زیج کے ابواب متعلقہ تعدیل کواکب کا اختصار کیا تھا، اور خوارزمی کی زیج کو از سر نو مرتب کیا تھا، اور بجائے فارسی تاریخ کے عربی تاریخیں استعمال کی تھیں۔ اس کے شاگردوں میں ابن السمح اور ابن الصفار مشہور تھے، یہ دونوں سدھانت (السند ہند) کے پیرو تھے۔

۹۔ لیکن نجوم و ہیئت کے اس عہد زریں میں صرف ایک دربار اس علم کی سرپرستی سے خالی ملتا ہے، وہ محمود غزنوی کا دربار ہے، حالانکہ بقول ابن الاثیر وہ علما و فضلا کو گھیر گھیر کر اپنے دربار میں لاتا تھا۔ اس کی وجہ اس کا سیاسی حزم و احتیاط تھا: نجوم و ہیئت کے ساتھ اعتنا، قرامطہ کا مخصوص شعار تھا، جن کی تخریبی سرگرمیوں سے پورا عالم اسلام لرزہ براندام تھا، محمود بھی ان سے غافل نہ تھا۔ اس لیے وہ کس طرح ان گہواروں کی سرپرستی کر سکتا تھا جو قرمطی تخریب پسندوں کے مرکز تھے۔ محمود کی اسی قرامطہ بیزاری کا نتیجہ تھا کہ اس نے فردوسی کو اس کی امید کے مطابق شاہنامہ کا صلہ نہیں دیا اور یہی وجہ تھی کہ اس نے البیرونی کو صحیح پیشین گوئی کرنے پر کوٹھے سے نیچے پھنکوا دیا۔ لیکن انکی وفات پر اس کے بیٹے مسعود نے اس فن کی سرپرستی کی۔ چنانچہ البیرونی نے "قانون مسعودی" مسعود ہی کے نام پر معنون کی ہے۔

پانچویں صدی ۔ عہد سلاجقہ | مسعودی کے آخری زمانہ میں سلاجقہ اس کے علی الرغم خراسان پر قابض ہو گئے۔

۴۴۷ھ میں انھوں نے بغداد پر بھی قبضہ کر لیا اور بویہی خاندان کو ختم کر کے خود امیر الامراء بن گئے۔ گو سلجوقیوں کو نہ تو ایرانیوں کی احیائیت پسندی (Revivalism) سے ہمدردی تھی اور نہ وہ اتنے متمدن تھے کہ علم الہیئت کی سرپرستی کرتے۔ بایں ہمہ انتظامی ضرورتوں کے پیش نظر انھیں بھی ہیئت کے ساتھ اعتنا کرنا پڑا۔

یہ ضرورت خراج کی ادائیگی کے وقت تعین کی تھی، معتضد باللہ عباسی نے تیسری صدی کے آخر میں نوروز کی اصلاح کی تھی، جسے دو سو سال ہو رہے تھے۔ اس لیے اس پر نظر ثانی کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی، اس لیے ۴۶۷ھ میں ملک شاہ سلجوقی اور اس کے وزیر نظام الملک کے حکم سے اصفہان میں ایک رصدگاہ قائم کی گئی جس میں ملک کے مشاہیر ہیئت داں جمع ہوئے۔ مثلاً عمر خیام (جو بقول ذکریا قزوینی اس رصدگاہ کا متولی تھا) ابو المظفر اسفزاری، میمون بن نجیب الواسطی، ابو العباس اللوکری، محمد بن احمد المعموری وغیرہم۔ اس رصدگاہ کا سب سے بڑا کام نوروز کا تعین تھا، جو ۴۷۱ھ میں ۱۰ رمضان کو واقع ہوا۔ اس کے علاوہ تقویم شمسی کی بھی اصلاح کی گئی اور اسی کی بنیاد پر ہندوستان میں عہد اکبری میں خراجی سال کا تعین کیا گیا۔

رصدگاہ ملک شاہی بقول ابن الاثیر ۴۸۵ھ میں ختم ہو گئی مگر ابھی عمر خیام اور ابو المظفر اسفزاری وغیرہ زندہ تھے، ان کے فیض تربیت سے دوسرے لوگوں نے ہیئت و فلکیات کے کام کو بعد میں جاری رکھا۔ ان میں دو شخص زیادہ مشہور ہیں۔

عبد الرحمٰن الخازن: جو ماسکونیات کی مشہور کتاب "میزان الحکمۃ" کا مصنف ہے۔ علم الہیئت میں اس نے "زیج سنجری" تصنیف کی تھی۔

بہاء الدین ابو محمد خرقی: حسب تصریح بیہقی، اس نے علم ہیئت میں متعدد کتابیں لکھی تھیں۔

جن میں "التبصرہ" زیادہ مشہور ہے۔

ساتویں صدی ہجری - یورشِ تاتار ساتویں صدی ہجری تاریخ اسلام کا انتہائی پُرآشوب دور ہے۔ اس زمانہ میں تاتاریوں نے تنہا قصرِ خلافت ہی کو منہدم نہیں کیا، بلکہ علم و حکمت کے اس چراغ کو بھی بجھانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی جو چھ سو سال سے جنوبی مغربی ایشیا میں روشن تھا۔

مگر اس ثقافت بیزاری کے باوجود تاتاریوں کو نجوم و ہیئت سے بڑی دلچسپی تھی اور انکے خاندان میں منگو قاآن اس فن کا بڑا شائق تھا۔ اسے رصدگاہ قائم کرنے کا بھی شوق تھا، چنانچہ اس نے جمال الدین محمد بن طاہر بن محمد الراوندی کو بلا کر یہ کام سپرد کیا۔ مگر اس سے اس کی تکمیل نہ ہو سکی، کچھ دن بعد خواجہ نصیر الدین طوسی کے فضل و کمال کی شہرت سنی، اس لیے جب اس نے ہلاکو کو الموت کی تسخیر کے لیے بھیجا تو اس سے خواہش کی کہ محقق طوسی کو رہا کرا کے دربار میں بھیجدے۔ مگر ہلاکو نے ان کے علم و فضل سے متاثر ہو کر انھیں اپنے پاس ہی رکھ لیا۔ جب ۶۵۶ھ میں ہلاکو تسخیر بغداد سے فارغ ہوا تو محقق طوسی نے اسے مراغہ (تبریز) میں رصدگاہ قائم کرنے کی ترغیب دی، اس کام کے لیے فضلائے مہندسین و ماہرین ہیئت جیسے موید الدین عرضی، نجم الدین کاتبی، فخر الدین مراغی، فخر الدین اخلاطی، محی الدین مغربی اور قطب الدین شیرازی وغیرہم بلائے گئے اور شہر مراغہ کے شمال میں ایک بلند ٹیلے پر مجوزہ رصدگاہ قائم ہوئی۔

رصدگاہ کا کام ۶۵۷ھ میں شروع ہوا، طوسی کے مشورے سے ہلاکو نے اس رصدگاہ پر بے دریغ روپیہ خرچ کیا۔ لیکن ابھی کام مکمل نہیں ہونے پایا تھا کہ ہلاکو نے وفات پائی۔ (۶۶۳ھ)۔ اس کے بعد بھی کام جاری رہا تا آنکہ ۶۷۲ھ میں محقق طوسی نے بھی وفات پائی۔ مگر وہ زیج (زیج ایلخانی) کو اپنی زندگی ہی میں مرتب کر چکا تھا۔ زیج ایلخانی کے علاوہ اس نے المجسطی" کو بھی "تحریر المجسطی" کے نام سے ایڈٹ کیا۔ اور بھی کتابیں ہیئت میں لکھیں جن میں

"تذکرہ" "رسالہ معینیہ" اور "بست باب" زیادہ مشہور ہیں۔

محقق طوسی کے رفقائے کار میں سب سے بڑے ماہر فن ان کے شاگرد قطب الدین شیرازی تھے، وہ بھی اس فن میں متعدد کتابوں کے مصنف ہیں، جن میں دو کتابیں زیادہ مشہور ہیں، "نہایۃ الادراک فی درایۃ الافلاک" اور "تحفۂ شاہیہ"۔

اگلی دو صدیوں میں کوئی بڑا ہیئت داں پیدا نہیں ہوا، اگرچہ اس زمانہ میں بھی ہیئت کے ساتھ اعتناء باقی رہا، مگر یہ "تحریر المجسطی" اور "تذکرہ" کے شرح و تحشیہ تک محدود تھا۔ ان میں نظام الدین اعرج کی شرح مشہور ہے، البتہ اسی زمانہ میں محمود بن عمر الجغمینی نے "الملخص فی الہیئۃ" کے عنوان سے ایک رسالہ لکھا جس کی شرح قاضی زادہ رومی نے کی۔ بعد میں یہ "شرح چغمینی" ہیئت کی درسی کتاب کی حیثیت سے عرصہ تک ہندوستان و ایران کے اندر متداول رہی۔

نویں صدی - رصدگاہ سمرقند تاتاریوں کی طرح تیموری مغلوں کو بھی نجوم و ہیئت سے بڑی دلچسپی تھی۔ تیمور (المتوفی ۸۰۷ھ) کا درباری منجم عبد اللہ بن مولانا لسان الدین تھا، شاہرخ کے دربار میں استاد قوام الدین معمار نجوم میں بھی دستگاہ عالی رکھتے تھے، لیکن بذات خاص اس علم سے دلچسپی شاہرخ کے بیٹے الغ بیگ (۸۵۰ھ - ۸۵۳ھ) کو تھی، اس نے اپنے زمانہ شاہزادگی ہی میں ۸۲۳ھ میں سمرقند میں ایک عظیم الشان رصدگاہ کی بنیاد ڈالی تھی۔ اس رصدگاہ کا پہلا متولی اس نے غیاث الدین جمشید کاشی کو مقرر کیا، ان کی وفات پر قاضی زادہ رومی کو اسکی تولیت سپرد ہوئی، اور ان کے انتقال پر رصدگاہ کا انتظام بادشاہ نے اپنے شاگرد رشید مولانا علاء الدین علی قوشجی کے سپرد کیا،

رصدگاہ سمرقند کے مشاہدہ کو "زیج جدید سلطانی" (زیج الغ بیگ) میں مدون کیا گیا۔ غیاث الدین جمشید کاشی نے لکھا ہے کہ "خسوفات قمر کو ہم نے خود رصد کیا ہے، اور انہی

مشاہدات کی بنا پر قمر کے اوساط و تعدیلات کی تصیح کی ہے، باقی کواکب کے باب میں ہم نے محقق طوسی کی "زیج ایلخانی" پر اعتماد کیا ہے، جمشید کاشی نے "زیج جدید" کے علاوہ اصطرلاب پر بھی ایک رسالہ "طبق المناطق" لکھا، جس کی بعد میں "نزاہۃ الحدائق" کے نام سے شرح کی۔

قاضی زادہ رومی کی "شرح چغمینی" کا ذکر اوپر آچکا ہے جو اس صدی کے ثلث اول تک ہمارے مدارس کے نصاب میں مشمول تھی۔

مولانا قوشجی نے رصدگاہ الغ بیگ کی تولیت کے فرائض انجام دینے کے علاوہ "اشکال قمر" پر بھی ایک رسالہ لکھا تھا، اور فن ہیئت میں ایک رسالہ بعنوان "رسالہ فتحیہ" لکھا، جو ہمارے ملک میں عرصہ تک "رسالہ قوشجیہ" کے نام سے داخل درس رہا ہے۔ اکثر علماء نے اس پر شروح لکھیں جن میں مولانا وجیہ الدین گجراتی کی شرح مشہور رہے۔

عہد آخر | عجم میں الغ بیگ کے بعد نہ کسی بادشاہ نے نجوم و ہیئت کی سرپرستی کی اور نہ کوئی صف اول کا ہیئت داں پیدا ہوا، صرف درسی طور پر ہیئت کا رواج رہا، یا بعض علماء نے پچھلی کتابوں کی شرحیں لکھیں، ان شراح میں عبد العلی برجندی کا نام خاص طور سے مشہور ہے، انھوں نے "تحریر المجسطی"، "تذکرہ" اور "زیج الغ بیگ" کی شروح لکھیں۔ ان کے علاوہ "آلات رصدیہ" پر بھی ایک مبسوط رسالہ لکھا۔

گیارہویں صدی کے علمائے ایران میں شیخ بہاء الدین عاملی کا نام مشہور ہے، وہ ایک شیعی عالم تھے اور ریاضی و ہیئت میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے۔ انھوں نے ہیئت میں ایک مختصر رسالہ "تشریح الافلاک" کے عنوان سے لکھا، یہ رسالہ اس حیثیت سے اہم ہے کہ بعد میں اسکے ساتھ ہندوستان میں خاصہ اعتناء کیا گیا۔

عجم میں تو ہیئت و فلکیات کی ترقی بند ہو گئی مگر ہندوستان میں اٹھارہویں صدی مسیحی تک بڑی شان سے جاری رہی لیکن اس کی تفصیل کے لیے ایک مستقل مقالہ کی ضرورت ہے۔

علامہ جلال الدین سیوطیؒ

از مولانا محمد عبد الحلیم صاحب چشتی فاضل دیوبند

(۵)

تصانیف کے متعلق اہل علم کی آراء | علامہ سیوطی کی تالیفات کے متعلق بعض اہل علم کی رائے ہے کہ وہ رطب و یابس کا مجموعہ ہوتی ہیں، اس بارہ میں فقیہہ عبد اللہ بن عمر بامخرمہ شافعی المتوفی ۹۷۲ھ کی رائے اوپر گذر چکی ہے۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے علامہ سیوطی کی مذہبی تالیفات کو چوتھے طبقہ کی کتابوں میں شمار کیا ہے، جن میں صحت کا پورا التزام نہیں ہوتا، الانتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ و وارثی اسانید رسول اللہ میں رقمطراز ہیں:۔

طبقہ رابعہ احادیثے کہ نام و نشان آنہا در قرون سابقہ معلوم نبود و متاخران ابراز آنہا کردہ اند، پس حال آنہا از دو شق خالی نیست یا سلف تفحص کردند و آنہا را اصلے نیافتند تا مشغول بروایت آنہا می شدند یا یافتند و در آن قدحے و علتے دیدند کہ باعث شد ہمہ آنہا را بر ترک روایت آنہا، وعلی کل تقدیر ایں احادیث قابل اعتماد نیستند کہ در اثبات عقیدہ یا عملے بآنہا تمسک کردہ شود و نعم ما قال بعض الشیوخ فی امثال ہذا شعر

فان کنت لا تدری فتلک مصیبۃ ۔۔۔ وان کنت تدری فالمصیبۃ اعظم

و ایں قسم احادیث را بسیارے از محدثین زدہ است و بجہت کثرت طرق ایں احادیث

کہ دریں قسم کتب موجود اند معزور شدہ حکم بتواتر آنہا نمودہ در مقام قطع یقین بداں تمسک جستہ برخلاف احادیث طبقات اولیٰ وثانیہ وثالثہ مذہبے برآوردہ اند و دریں قسم احادیث کتب بسیار مصنف شدہ اند بر شمار یم کتاب الضعفا لابن حبان وتصانیف الحاکم، کتاب الضعفاء للعقیلی کتاب الکامل لابن عدی، تصانیف ابن مردویہ تصانیف خطیب، تصانیف ابن شاہین، تفسیر ابن جریر، فردوس دیلمی بلکہ سائر تصانیف او تصانیف ابی نعیم، تصانیف جوزقانی، تصانیف ابن عساکر، تصانیف ابو الشیخ تصانیف ابن نجار .... مایہ تصانیف شیخ جلال الدین سیوطی در رسائل و نوادر ہمیں کتابہا است واشتغال باحادیث ایں کتب واستنباط احکام از آنہا لاطائل می نمایند۔[1]"

نواب صدیق حسن خاں قنوجی، اتحاف النبلاء المتقین میں فرماتے ہیں:

"در تصانیف سیوطی باینہمہ جلالتِ شان علم وعمل وحصول رتبۂ اجتہاد نوعے تساہل است زیرا کہ نظر او بر جمیع روایات ودرایات است، بس با تنقیح وتحقیق وتصحیح وتضعیف کارے ندارد و الا قلیلاً نادراً وظاہر ست کہ تبحر واطلاع وعبور چیزے دیگر است وتنقیر وتفتیشِ صحیح از سقیم وقوی از ضعیف ومرجوح از راجح چیزے دیگر ولہذا علماء محققین تحریر ایشاں را بدون شہادت تحریر مصنفین دیگر واعتضاد محققین اخر

[1] ملاحظہ ہو الانتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ ووارثی اسانید رسول اللہ، (قلمی) اس کا نسخہ جو شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کے فرزند عمر دہلوی کے نسخہ کی نقل ہے۔ وہ مولانا محمد عبدالرشید صاحب نعمانی کے پاس موجود ہے، شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ نے عجالہ نافعہ میں الانتباہ سے یہ عبارت نقل کی ہے، حجۃ اللہ البالغہ سے ترجمہ نہیں کیا ہے۔

قبول نمی کنند۔[1] دسرمایۂ شور وغوغائے اہل بدعت واہوا از فرقہ اہل سنت بگانہ فرق شیعہ غالباً تالیف ایشان ست[2] کہ از رطب ویابس وغث وسمین ہمہ حصۂ وافر دارد ومع ذٰلک شک نیست کہ تصانیف ایشان برائے مبتدی ومنتہی باس المال کمال ست

اگر شخصے محقق باشد ونصیبے از امعان نظر داشتہ باشد وخواہد کہ در بابے از ابواب علوم تالیفے پردازد، رسائل ومؤلفات سیوطی برائے مدد او کافی ووافی ست کہ روایات ہر مذہب واقوال مختلف اہل علم را مشتمل ومحتوی ست ودر نقل آں معتمد اگرچہ در نفس الامر بعضے ضعیف وبعضے قوی خواہد بود واللہ اعلم بالصواب۔[3]"

سیوطی کی تصانیف میں رطب یابس بلاتحقیق وتنقیح نہیں

لیکن یہ بات کہ علامہ سیوطی کی تالیفات رطب ویابس کا مجموعہ ہوتی ہیں، اس لیے قابل اعتماد نہیں، محل نظر ہے۔

اس میں شبہہ نہیں کہ علامہ سیوطی کی تالیفات رطب ویابس کا مجموعہ ہوتی ہیں، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان میں بے سروپا باتیں ہوتی ہیں، یا بغیر سند اور بلا حوالہ اقوال وآثار نقل کر دیے جاتے ہیں، یہاں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جن علما نے انکی تصانیف کے متعلق رطب ویابس کا لفظ استعمال کیا ہے، ان سے ان کا مقصد صرف اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ علامۂ موصوف کی تالیفات ایسی نہیں ہیں جن پر آنکھ

[1] علامہ سیوطی کی تالیفات کے سلسلہ میں کسی عالم سے بھی یہ شرط منقول ہو۔ [2] غالباً اسی لیے شیعہ تذکرہ نگاروں میں سے خوانساری نے روضات الجنات (طبع طہران ۱۳۶۷ھ ص ۴۳۲) میں علامہ سیوطی کو علمائے اہل تشیع میں شمار کیا، حالانکہ ان کو شیعیت سے دور کا بھی کوئی علاقہ نہیں۔ [3] اتحاف النبلاء المتقین باحیاء مآثر الفقہاء المحدثین، مطبوعہ نظامی پریس کانپور ۱۲۸۸ھ ص ۲۹۲

بند کرکے عمل کیا جا سکے، بلکہ غور وفکر کی محتاج ہیں، علامہ سیوطی کا مزاج جمع وترتیب کا ضرور ہے لیکن وہ تحقیق وتنقیح سے بھی غافل نہیں رہتے، انھوں نے اپنی کتابوں میں تحقیق وتنقیح کا حق ادا کرنے کی بھی کوشش کی ہے، جہاں سے جو چیز لیتے ہیں اس کا حوالہ بھی دیدیتے ہیں، جس سے اس کا مقام ومرتبہ متعین ہوجاتا ہے اور ہر شخص یہ جان لیتا ہے کہ اس کی حیثیت کیا ہے، علامہ سیوطی کی تالیفات کا یہی طرۂ امتیاز ہے، اس طریقہ کو اختیار کرنے سے مباحث کا پورا استیعاب ہوجاتا ہے، اور اس میں زیر بحث مسئلوں پر تمام ممکن مواد اکٹھا کر دینا ضروری ہے، اس لیے وہ رطب یابس کو کتاب میں پیش کرنے سے گریز نہیں کرتے لیکن اس طرح نہیں کہ قوی اور ضعیف، صحیح اور سقیم میں امتیاز باقی نہ رہے اور رطب یابس میں تمیز نہ کی جا سکے، بلکہ وہ ہر کتاب میں کچھ ایسی علامتیں مقرر کر دیتے ہیں جس سے ہر صاحب علم صحیح اور سقیم، قوی وضعیف کو پوری طرح سمجھ سکتا ہے، اور مسئلہ زیر بحث کے تمام پہلوؤں پر غور کرکے آسانی سے صحیح نتیجہ تک پہنچ سکتا ہے، اسی نکتہ کو نظر انداز کرنے سے علامہ سیوطی کی تالیفات کے بارے میں غلط فہمیاں پیدا ہوئی ہیں، شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ فتاوی عزیزیہ میں اسی امر کی طرف اشارہ فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

"بیان آنکہ سیوطی در تصانیف خود رطب ویابس بسیار می آرد، پس این قدر التماس می دارد کہ سیوطی در تصانیف خود رطب یابس می آورد اما در صدر نقل می گوید کہ اخرج فلان من طریق فلان کذا پس ازیں عبارت محدث را بدو وجہ حال آن نقل مفہوم می شود۔

اول ذکر مخرج کہ بعضے مخرجین در کتاب ہائے خود التزام نمودہ اند نزد محدثین کہ ہرچہ در آنجا است ضعیف ومنکر است لا بعبأ بہ مثل تفسیر ابن مردویہ، وکامل ابن عدی، وتاریخ خطیب، وفردوس دیلمی وتاریخ ابن عساکر وکتاب العظمہ لابی ہشیم

دوم بیان طریق کہ در ضمن آن مدار سند حدیث از، حال مفہوم می شود وحال

آن مدار نزد محدث اہر معروفست، پس در حقیقت سیوطی ہم اہمال در بیان نمودہ ودر تفسیر ودر منثور اکثر این طریق بیان را مسلوک می نماید ودر کتب دیگر نیز در حقیقت تصنیف سیوطی ہمین یک کتاب ست یعنی در منثور، ودیگر جمیع رسائل از مثل اتقان وبدور سافرہ وشرح الصدور وغیرہ ہمہ مستخرج از ہمین کتاب اند وعلی ہذا القیاس در جمع الجوامع کہ اصل جامع صغیر است نیز این طریقہ ملحوظ دارد۔"[1]

بعض قرائن سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کا اعتراض علامہ سیوطی کی زندگی میں بھی ہوا تھا، جس کا جواب انھوں نے یہی دیا ہے کہ جن مصنفین کے پیش نظر استیعاب مباحث ہوتا ہے وہ رطب ویابس سب کچھ کتاب میں پیش کر دیتے ہیں، چنانچہ الخصائص الکبریٰ میں لکھتے ہیں

اعلم انی اذکر کل ماقال فیہ	میں ہر اس بات کو بیان کروں گا جس
عالم انہ من خصائص سواء	کی نسبت کسی عالم نے کہا کہ یہ آنحضرت
کان علیہ اصحابنا ام لا مصحا	صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائص میں سے
ام لا فان ذلک داب المتتبعین	ہے خواہ ہمارے اصحاب اس کے قائل
المستوعبین وان کان الجہلۃ	ہوں یا نہ ہوں اور وہ اس کو صحیح تسلیم
القاصرون اذا راوا مثل ذلک	کرتے ہوں یا نہ کرتے ہوں، اس لیے کہ جن
بادروا الی الانکار علی مورد ہ[2]	لوگوں کا مقصد تتبع اور استیعاب ہے ان کا یہی طریقہ ہے
	اگرچہ کم فہم جاہل جب ایسی بات دیکھتے ہیں
	تو بیان کرنے والے پر رد وقدح کرنے لگتے ہیں:

اس جواب کا تعلق اگرچہ سیر ومناقب سے ہے جس میں صحیح وغیر صحیح ہر قسم کی روایتیں بیان کی جاتی ہیں

[1] ملاحظہ ہو مجموعۂ فتاوی عزیزیہ مطبع مجتبائی دہلی ۱۳۱۳ھ ج ۲ ص ۱۸۱ و ۲۰۲ ۔ [2] ملاحظہ ہو خصائص الکبریٰ طبع حیدرآباد دکن ۱۳۲۰ھ ج ۲ ص ۲۲۹

تاہم اس سے ان کا مرکزی نقطۂ نگاہ واضح ہوجاتا ہے۔

یہاں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ علامہ سیوطی اپنی تالیفات میں رطب و یابس اکٹھا پیش نہیں کرتے۔

ان امور کی روشنی میں علامۂ موصوف کی تالیفات کے جامع، مفید اور مستند ہونے میں کیا شبہہ ہوسکتا ہے، جن بالغ نظر علما، نے علامہ سیوطی کی تالیفات کو جامع، مفید اور مستند کہا ہے ان کے پیش نظر بھی یہی نکتہ رہا ہے، چنانچہ شیخ الاسلام غزی شافعی نے ان کی تالیفات پر مختصر و جامع تبصرہ کیا ہے:

الف المولفات الحافلة الكثيرة	موصوف نے نہایت جامع، مبسوط
الكاملة الجامعة النافعة	مفید، پائیدار، قابل اعتبار اور
المتقنة المحررة المعتمدة	لائق اعتماد کتابیں تالیف کی ہیں۔
المعتبرة[1]	

ابن العماد حنبلی نے بھی ان کی تالیفات کے بارہ میں شذرات الذہب فی اخبار من ذہب میں بعینہٖ یہی الفاظ نقل کیے ہیں[2]، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی نظر میں بھی علامہ سیوطی کی تالیفات کا وہی مقام ہے، جو محدث غزی کی نظر میں تھا، مولانا عبد الحیٔ فرنگی محلی کی رائے بھی یہی ہے، وہ لکھتے ہیں:

وتصانيفه كلها مشتملة على	سیوطی کی تمام تصانیف عمدہ فوائد
فوائد لطيفة وفرائد شريفة	اور اچھے مباحث پر مشتمل ہیں اور
تشهد كلها بتبحره وسعة نظره	ہر کتاب ان کے تبحر، وسعت نظر اور

۱؎ ملاحظہ ہو الکواکب السائرہ ج ۱ ص ۲۲۸ ۲؎ شذرات الذہب ج ۸ ص ۵۳

ودقة فكره[1]	دقت فکر کی شاہد ہے،

علامہ سیوطی کی تصانیف کی تعداد

کثرت تالیفات میں علامہ سیوطی قد مار کی یادگار تھے اور متاخرین میں بہت ہی کم علما، ان کی ہمسری کرسکتے ہیں، ان کی تصانیف کی تعداد کے بارہ میں مورخین اور تذکرہ نگاروں کے اقوال مختلف ہیں، خود سیوطی نے حسن المحاضرہ میں اپنی تالیفات کی تعداد تین سو بتائی ہے[2]، یہ تعداد ان تالیفات کے علاوہ ہے جن سے انھوں نے رجوع کرلیا تھا، یا دریا برد کرایا تھا، یہ کتابیں فن تفسیر، حدیث، قرأت، فقہ، عربیت اور آداب وغیرہ میں ہیں۔

ان کے تلمیذ شیخ عبدالوہاب شعرانی نے ذیل الطبقات میں تالیفات کی تعداد چار سو ساٹھ لکھی ہے[3]، نواب صدیق حسن خاں صاحب قنوجی نے لکھا ہے کہ ان کی چھوٹی بڑی تالیفات کی تعداد چار سو ساٹھ تک پہنچتی ہے[4]، جرمن مستشرق بروکلمان نے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تالیفات کی تعداد چار سو پندرہ بیان کی ہے،

مورخ نجم الدین غزی نے سیوطی کے نامور شاگرد شمس الدین داودی سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے علامہ سیوطی کے تذکرہ میں ان کی تالیفات کو نام بنام گنایا ہے، انکی تعداد پانچ سو سے اوپر ہے جو شہرت کی بنا پر تفصیل سے مستغنی ہیں[5]۔

علامہ سیوطی کی تصانیف پر ہندوستان میں غالباً سب سے پہلی کتاب مولانا عبدالاول جونپوری نے لکھی، جو شکر المعطی فی ذکر مؤلفات الامام السیوطی کے نام سے شائع ہوچکی ہے، اس میں انھوں نے ان کی تالیفات پانچسو سے زیادہ گنائی ہے، چنانچہ وفیات المشاہیر میں لکھتے ہیں:-

۱؎ التعلیق الممجد علی موطا محمد، طبع نور محمد کراچی ۱۹۶۳ء ص ۲۵ ۲؎ حسن المحاضرہ ج ۱ ص ۱۹۰ ۳؎ ذیل الطبقات بحوالہ جہد الامام السیوطی و تحقیق موضعہ از احمد تیمور پاشا طبع قاہرہ ۱۳۲۶ھ ص ۴ ۴؎ اتحاف النبلاء المتقین ص ۲۹۱
۵؎ الکواکب السائرہ ج ۱ ص ۲۲

"آپ کی تصانیف پانچسو سے زیادہ ہیں جن کو میں نے شکر المعطی میں شمار کر دیا ہے"[۱]۔

مولانا عبدالحئی فرنگی محلی کا بھی یہی مختار رہے، چنانچہ کتاب الفوائد البہیہ میں مذکور ہے،

وقد زادت علی خمسمائۃ شہرۃ ذکرہ تغنی عن وصفہ[۲]

سیوطی کی تالیفات پانچ سو سے زیادہ ہیں، ان کی شہرت بیان سے مستغنی ہے،

جمیل بک العظم نے تصانیف کی تعداد تقریباً پانچسو چھہتر لکھی ہے[۳]،

مشہور مستشرق فوغل نے کسی بالغ نظر عالم کی مرتب کردہ فہرست تالیفات الامام السیوطی کے نام سے کشف الظنون کے آخر میں شامل کر دی ہے، کشف الظنون لاطینی ترجمہ کے ساتھ لیبزک سے ۱۸۳۵ء میں شائع ہوئی ہے اس میں تالیفات کی تعداد ۵۶۰ ہے[۴]، علامہ سیوطی کے تلمیذ خاص مورخ مصر ابن ایاس حنفی المتوفی ۹۳۰ھ کا بیان ہے کہ سیوطی کی تالیفات کی تعداد چھ سو تک پہنچتی ہے[۵]۔

شیخ محی الدین عبدالقادر عیدروسی المتوفی ۱۰۳۸ھ النور السافر میں لکھتے ہیں

وصلت مصنفاتہ نحو الستمائۃ مصنفاً سوی ما رجع عنہ و غسلہ

سیوطی کی تصانیف کی تعداد ان کی تالیفات کے علاوہ جن سے انھوں نے رجوع کیا یا انکو دھو ڈالا چھ سو کے قریب ہے'

محدث بدر الدین محمد بن یحییٰ قرافی مالکی المتوفی ۱۰۰۸ھ اپنے شیخ ابو عبداللہ محمد بن ابی الصفا شہاب الدین بکری کے تذکرہ میں لکھتے ہیں؛

---

[۱] وفیات المشاہیر، مطبوعہ جادو پریس جونپور [۲] الفوائد البہیہ مع التعلیقات السنیہ، مطبع چشمہ فیض ۱۳۰۴ھ ص ۱۵، [۳] عقود الجواہر فی تراجم من لہم خمسون تصنیفاً فمائۃ فاکثر، طبع بیروت ۱۳۲۶ھ ص ۱۹۵ تا ۲۱۶ [۴] ملاحظہ ہو کشف الظنون، طبع لیبزک لیڈن ج ۶ ص ۶۷۵ [۵] بدائع الزہور فی وقائع الدہور ج ۳ ص ۶۳

انہ قرأ علی شیخہ الحافظ السیوطی فہرس اسماء مؤلفاتہ قال وھی ستمائۃ[۱]

انھوں نے اپنے شیخ حافظ سیوطی کو انکی مولفات کی فہرست پڑھ کر سنائی تھی ان کا بیان ہے کہ وہ چھ سو تھیں۔

شیخ شہاب الدین احمد مکناسی المتوفی ۱۰۲۵ھ درۃ الحجال فی اسماء الرجال میں لکھتے ہیں:

ان تصانیفہ لا تحصی تجاوز الالف[۲]

ان کی تالیفات حد شمار سے باہر ہیں وہ ہزار سے بھی اوپر ہیں،

حافظ سید عبدالحئی کتانی کو مصر میں علامہ سیوطی کی تالیفات کی جو فہرست کتب دستیاب ہوئی تھی اس میں ان کی وفات سے سات سال قبل کی ۹۰۴ تالیفات کا ذکر تھا، یہ غالباً ان کی تصانیف کی کل تعداد ہے جس میں وہ سب کتابیں داخل ہیں جن سے موصوف نے رجوع کیا یا جو دریا برد کر دی تھیں[۳]۔

تصانیف کی شہرت و مقبولیت | علامہ سیوطی کی تالیفات میں بلاشبہ منقولات کا حصہ زیادہ ہوتا ہے لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان میں معلومات و فوائد کا ایسا نادر ذخیرہ یکجا مل جاتا ہے جو اور کتابوں میں یکجا نہیں مل سکتا، اسی لیے ان کی تالیفات کو ان کی حیات ہی میں قبولیت عام کی سند حاصل ہو گئی تھی، مورخ غزی کا بیان ہے:

وقد اشتھر اکثر مصنفاتہ فی حیاتہ فی البلاد الحجازیۃ والشامیۃ والحلبیۃ وبلاد الروم والمغرب التکرور والھند والیمن[۴]

ان کی اکثر تالیفات ان کی حیات میں بلاد حجاز، شام، حلب، بلاد روم، مغرب، تکرور، ہندوستان اور یمن میں مشہور ہو گئیں

---

[۱] فہرس الفہارس والاثبات ج ۲ ص ۳۵۹ [۲] درۃ الحجال بحوالہ فہرس الفہارس والاثبات ج ۲ ص ۳۵۹ [۳] ایضاً کتاب مذکورہ [۴] الکواکب السائرہ ج ۱ ص ۲۲۸

شذرات الذہب فی اخبار من ذہب میں مذکور ہے

وقد اشتہر اکثر مصنفاتہ فی حیاتہ فی اقطار الارض شرقاً وغرباً[1]

ان کی حیات ہی میں ان کی اکثر تصنیفیں دنیا کے گوشہ گوشہ میں مشرق سے مغرب تک پھیل گئی تھیں۔

قاضی محمد بن علی شوکانی فرماتے ہیں:

وتصانیفہ فی کل فن من الفنون مقبولۃ وقد سارت فی الاقطار سیر النہار[2]

ان کی تصنیفات ہر فن میں مقبول ہیں اور روز روشن کی طرح عالم میں پھیل گئی ہیں۔

محدث شوکانی نے ایک اور موقع پر لکھا ہے:

ان مؤلفاتہ انتشرت فی الاقطار وسارت بہا الرکبان الی الانجاد والاغوار ورفع اللہ لہ من الذکر الحسن والثناء الجمیل مالم یکن لاحد من معاصریہ (البدر الطالع ج ۱ ص ۳۳۴)

ان کی تالیفات چار دانگ عالم میں پھیلیں، شہ سوار ان کو بالائی اور نشیبی حصوں میں لے گئے، اللہ تعالیٰ نے انکو شہرت ونیکنامی کی وہ عزت ورفعت بخشی جو انکے معاصرین میں کسی کو حاصل نہ ہو سکی،

مولانا عبد الحئی فرنگی محلی نے التعلیقات السنیہ میں لکھا ہے:

جلال الدین ...... صاحب التصانیف التی سارت بہ

جلال الدین ایسے صاحب تصانیف ہیں کہ ان کی کتابوں کو سوار لے اڑے

[1] شذرات الذہب از محمد بن العماد حنبلی ج ۸ ص ۵۳ [2] البدر الطالع ج ۱ ص ۳۲۸

الرکبان وانتفع بہ الانس والجان[1]

اور ان سے انس وجن مستفید ہوئے

نواب صدیق حسن خاں قنوجی اتحاف النبلاء المتقین میں رقمطراز ہیں:

"مصنفاتش ...... در اقطار ارض از شرق وغرب منتشر گردیدہ ومسلمانان بداں منتفع شدند"[2]

تصانیف کے ساتھ علماء کا اعتناء

سیوطی کی وفات کے بعد ان کی تصانیف کی قبولیت وشہرت بڑھتی ہی جس کی بڑی دلیل یہ ہے کہ علماء اور مصنفین کا ہمیشہ ان کی تالیفات کے ساتھ اعتناء رہا، ان کی شرحیں اور حاشیے لکھے گئے اور ان کی حیات ہی میں بعض علماء نے تمام عمر ان کی تصانیف کے مطالعہ میں بسر کردی۔ مورخ غزی شیخ حسن بن ثابت زمزمی المتوفی ۹۲۱ھ کے تذکرہ میں لکھتے ہیں:

اعتنی بعلم الزیارج وبتصانیف الشیخ جلال الدین السیوطی رحمہ اللہ تعالیٰ[3]

انھوں نے فن زیج اور سیوطی علیہ الرحمہ کی تصانیف سے بڑا اعتناء کیا۔

حافظ محمد بن طولون حنفی دمشقی المتوفی ۹۵۳ھ نے جو کثیر التصانیف علماء میں سے تھے، اپنی مشہور تصنیف کتاب التعلیقات میں علامہ سیوطی کی بہت سی تالیفات کو جمع کر دیا ہے،

ابو الفلاح عبد الحئی بن العماد حنبلی المتوفی ۱۰۸۹ھ کا بیان ہے

کتب بخطہ کثیرا من الکتب وعلق ستین جزاء سماہا بالتعلیقات وکل جزء منہا

انھوں نے اپنے قلم سے بہت سی کتابیں لکھی ہیں اور ساٹھ جز کی ایک کتاب مرتب کی ہے، جو کتاب التعلیقات کے نام سے موسوم ہے،

[1] الفوائد البہیہ و التعلیقات السنیہ ص ۱۵ [2] اتحاف النبلاء المتقین، مطبع نظامی کانپور ۱۲۸۸ھ ص ۲۹۱

[3] الکواکب السائرہ ج ۱ ص ۷۷

يشتمل على مؤلفات كثيرة اكثرها من جمعه ومنها كثير من تاليفات شيخه السيوطي وكان واسع الباع في غالب العلوم المشهورة[1]

اس کا ہر جزء بہت سی کتابوں پر مشتمل ہے جو زیادہ تر ان کی اپنی جمع کردہ ہیں اور بہت سی ان کے شیخ سیوطی کی تالیفات ہیں جنھیں اکثر علوم متداولہ میں ید طولیٰ حاصل تھا۔

اسی لیے شیخ عبدالوہاب شعرانی نے فرمایا ہے:

ولو لم يكن للسيوطي من الكرامات الا اقبال الناس على تاليفه في سائر الاقطار بالكتابة والمطالعة لكان في ذلك كفاية[2]

علامہ سیوطی کی اگر اور کرامتیں نہ ہوتیں تو ان کے لیے یہی کرامات کافی تھی کہ عالم میں ہر طرف اہل علم ان کی کتابوں کے مطالعہ و کتابت میں مصروف ہیں۔

شیخ الاسلام محمد غزی ساسانی المتوفی سنہ ۱۰۶۱ھ کا قول ہے:

ولو لم يكن له من الكرامات الا كثرة المؤلفات مع تحريرها وتدقيقها لكفى ذلك شاهدا لمن يؤمن بالقدرة[3]

علامہ سیوطی کی اگر کرامتیں نہ ہوتیں تو ان کی تالیفات کی کثرت اور تحقیق و تنقید ہی ایک مرد مومن کے لیے ان کی کرامت کا ثبوت ہے۔

اس سلسلہ میں حافظ سید عبدالحی کتانی کا تبصرہ بھی پڑھنے کے لائق ہے، وہ لکھتے ہیں

قلت هذا امر جدير بالاعتبار فان مؤلفاته بالنسبة لمعاصريه وشيوخه حصلت على اقبال عظيم

یہ امر کیا کم لائق اعتبار ہے کیونکہ امت مسلمہ کی جیسی عظیم توجہ ان کی تالیفات پر رہی ہے ویسی توجہ ان کے معاصرین اور شیوخ وغیرہ

۱؎ ملاحظہ ہو شذرات الذہب ج ۸ ص ۲۹۹ ۲؎ فہرس الفہارس والاثبات ج ۲ ص ۳۵۹ ۳؎ الکواکب السائرہ ج ۱ ص ۲۲۹ وشذرات الذہب ج ۸ ص ۵۴

عند الامة الاسلامية لم يحصل عليها غيره ولا تكاد تجد خزانة في الدنيا عربية او عجمية تخلو عن العدد العديد منها بخلاف مؤلفات اقرانه بل وشيوخه فانها اعز من بيض الانوق[1]

کی تالیفات پر نہیں رہی ہے، دنیائے عرب و عجم کا کوئی کتب خانہ ان کی متعدد تصانیف سے خالی نہیں ہے، اس کے برعکس ان کے ہمسر اور شیوخ کی تالیفات کا یہ حال ہے کہ وہ شترمرغ کے انڈوں سے بھی زیادہ نایاب ہیں،

وفات علامہ سیوطی کو آخر عمر میں دائیں بازوں میں درد ہوا، اور ورم آگیا، تکلیف روز بروز بڑھتی گئی، ایک ہفتہ بڑی تکلیف سے بسر ہوا، اسی مرض میں شب جمعہ ۱۹ جمادی الاولیٰ ۹۱۱ھ/۱۵۰۵ء کو اپنے مکان واقع روضۃ المقیاس میں وفات پائی، حسب تصریح غزی انتقال کے وقت علامہ کی عمر ۶۱ سال ۱۰ مہینے اور اٹھارہ دن تھی[2]، جنازہ میں عوام و خواص سبھی نے شرکت کی، جمعہ کے دن قرافہ کے باہر حوش قوصون میں دفن کیے گئے۔

ان کی وفات کی خبر ممالک اسلامیہ میں پہنچی، تو وہاں غائبانہ نماز جنازہ پڑھی گئی، محدث شام حافظ محمد ابن طولون المتوفی ۹۵۳ھ کا جن کو علامہ سیوطی سے کتابۃً روایت حدیث کی اجازت بھی حاصل ہے، بیان ہے کہ پنجشنبہ ۱۵ رجب ۹۱۱ھ کو شیخ جلال الدین سیوطی کی وفات کی خبر مشہور ہوئی، اور بعد نماز جمعہ جامع اموی دمشق میں ان کی غائبانہ نماز جنازہ ادا کی گئی[3]، وفات کے تین سو برس بعد ۱۲۱۱ھ میں ان کے مزار پر قبہ تعمیر کیا گیا، شیخ علی مبارک [illegible] المتوفی ۱۳۱۱ھ کا بیان ہے:

۱؎ فہرس الفہارس والاثبات ج ۲ ص ۳۵۸ ۲؎ ملاحظہ ہو الکواکب السائرہ ج ۱ ص ۲۳۱
۳؎ مفاکہۃ الخلان فی حوادث الزمان طبع قاہرہ ۱۳۸۱ھ ج ۱ ص ۲۹۵

دفن بحوش قوصون خارج باب
القرافة وقبره ظاهر يزار
وعليه قبة وعلى باب القبة
تاريخ عمارتها جرت فيها سنة
احدى عشرة ومائتين والف
ويعمل له بها مولد كل سنة
في شعبان[1]

حوش قوصون میں در قرافہ کے باہر ان کو دفن کیا گیا، ان کا مزار زیارت گاہ خلائق ہے، مزار پر ایک قبہ ہے، قبہ کے دروازہ پر تاریخ تعمیر ۱۲۱۱ھ تحریر ہے، ان کا یوم ولادت ہر سال ماہ شعبان میں منایا جاتا ہے۔

باب قرافہ کے باہر حوش قوصون میں مدفون ہونے پر تمام تذکرہ نگاروں کا اتفاق ہے، لیکن حوش قوصون میں کس جگہ دفن ہیں، اس میں عصر حاضر کے تذکرہ نگاروں کا اختلاف ہے، تیمور باشا نے قبر الامام السیوطی کے نام سے جو مختصر رسالہ لکھا ہے اس میں حوش قوصون کے اندر جامع کبیر کے پاس مدفن بتایا ہے، اور یہ تصریح کی ہے کہ اب یہاں تمام قبروں کے آثار مٹ گئے ہیں، صرف ان کی قبر پر ایک قبہ باقی رہ گیا ہے، یہی علامہ سیوطی کی قبر کا نشان ہے، یہ مقام آج بھی زیارت گاہ خلائق ہے، لیکن شیخ محمد زاہد کوثری کی تحقیق ہے کہ حوش قوصون میں قلعہ کے نیچے مدفون ہیں۔[2]

ان کی وفات پر شاعروں نے بڑے پُر درد مرثیہ کہے تھے، شیخ عبد الباسط بن خلیل حنفی نے بارہ شعروں پر مشتمل ایک بہت پُر درد مرثیہ لکھا ہے، جس کو حافظ ابن طولون نے مفاکہۃ الخلان میں نقل کیا ہے، اور اسی کے حوالے سے مورخ غزی نے اس کو الکواکب السائرہ میں درج کیا ہے، اس کے چند شعر ہدیۂ ناظرین ہیں:

[1] الخطط التوفیقیۃ الجدیدۃ لمصر القاہرۃ ومدنہا وبلادہا القدیمۃ والشہیرۃ طبع اولیٰ، بولاق مصر ۱۳۰۶ھ ج ۶ ص ۵۰
[2] ذیل طبقات الحفاظ للذہبی (ترجمۃ المصنف از محمد زاہد کوثری) طبع دمشق ۱۳۴۷ھ ص ۱۰

مات جلال الدين غيث الورى
مجتهد العصر امام الوجود

جلال الدین وفات پا گئے، جو مخلوق کے حق میں ابر کرم تھے، مجتہد دوراں اور امام خلق تھے،

وحافظ السنة مهدي الهدى
ومرشد الضال بنفع الوجود

اور حافظ سنت اور راہ ہدایت کے ہادی تھے، اور گمراہ کے فیض رساں رہبر تھے

فيا عيوني انهملي بعده
ويا قلوب انفطري بالوقود

اے میری آنکھو! ان کے بعد برابر روتی رہو اور اے قلوب آتش فراق سے پھٹ جاؤ

مصيبة جلت فحلت بنا
واورثت نار اشتعال الكبود

ہم پر بہت بڑی مصیبت نازل ہوئی ہے، اور جگر میں آگ لگا دی ہے،

صبرنا الله عليها واولاده
نعيماً احل دار الخلود

اس مصیبت پر اللہ تعالیٰ ہم کو اور انکی اولاد کو صبر عطا فرمائے کیونکہ وہ غیر فانی جنت میں پہنچ گئے ہیں

وعمه منه بوبل الرضى
والغيث بالرحمة بين اللحود[1]

رضائے الٰہی کی موسلا دھار بارش ان پر برسے اور مزار پر باران رحمت ہو۔

ان کی ہر دلعزیزی اور مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ غسال نے غسل دینے کے بعد جب انکی قمیص اور ٹوپی لی تو تبرک سمجھ کر کسی نے قمیص پانچ دینار اور ٹوپی تین دینار میں غسال سے خرید لی تھی۔

[1] ملاحظہ ہو مفاکہۃ الخلان ص ۳۰۲ اور الکواکب السائرہ ج ۱ ص ۲۳۱

ہندی شاعری کا ایک تاریخی جائزہ

از جناب زیدی جعفر رضا صاحب شعبۂ ہندی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

(۷)

شرنگار کال

بھگتی کالین کاویہ کے اثرات

ہندی ادب کے بھگتی کال میں بہت باثر اور عظیم شعراء گذرے ہیں، جن کے نئے آدرشوں اور زندگی کے جدید فلسفہ کے ذریعہ ہندی شاعری بڑی تیزی سے نئے راستوں کی طرف بڑھی، اس اعتبار سے ۱۵ ویں صدی سے لیکر ۱۷ ویں صدی تک کا ادب بھگتی کا لہریں لیتا ہوا ساگر کہا جا سکتا ہے۔ ۱۶۰۰ ویں صدی عیسوی کے آخری حصہ میں ہندی شعراء کی طبیعت کا جھکاؤ شرنگار یا تعشق کی طرف ہوا، اور عشقیہ شاعری نے ہندی ادب کی آغوش میں آنکھیں کھولیں، ہندی شعراء کا ذہن تعشق کی طرف متوجہ کرنے میں بھگتی شاعر ودیاپت کے ساتھ مسلمان صوفی شعراء کا بھی بڑا حصہ ہے، سنتوں اور صوفیوں نے محبت کے جس تار کو چھیڑا تھا اس نے موجودہ دور میں بچن پنت نرالا اور مہادیوی ورما جیسے شعراء کو جنم دیا،

اکبر سے پہلے بھی مسلمان حکمرانوں نے ہندی ادب کی سرپرستی کی، لیکن اکبر نے جس طرح ہندی شعراء کی ہمت افزائی کی اس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی، اکبر کے دربار میں ہندی شعراء کا بڑا اجتماع تھا، خود شہنشاہ نے برج بھاشا میں اشعار اور کبت نظم کر کے آیندہ سلاطین کے لیے مثال قائم کی، بیربل، رحیم، تان سین، فیضی، ٹوڈرمل، گنگ، نرہری وغیرہ جیسے

شعراء اکبر کی ہندی شاعری سے دلچسپی کا نتیجہ تھے،

اکبر سے قبل بھی کئی مسلمان بادشاہوں کا ہندی کی طرف رجحان تھا، بیجاپور کے حاکم عادل شاہ کا بیٹا ابراہیم عادل شاہ جس وقت تخت نشین ہوا، تو اس نے حکم دیا تھا کہ سلطنت کا سارا حساب کتاب فارسی کے بجائے ہندی میں رکھا جائے، ابراہیم عادل شاہ کی تصنیف نورس ہندی شاعری میں ایک قابل قدر اضافہ ہے، ہمایوں کے درباری شعراء میں کچھ ایسے بھی تھے، جو ہندی میں باقاعدہ شاعری کرتے تھے، ان شعراء میں شیخ عبدل بلگرامی اور شیخ گدائی کا نام لیا جاتا ہے، لیکن ان کے بارے میں اور کچھ بھی پتہ نہیں چلتا، ہمایوں کے درباری شعراء میں سب سے زیادہ اہم نرہری تسلیم کیا جاتا ہے، جسے اکبر کا درباری شاعر ہونے کا بھی شرف حاصل تھا، نرہری کی تخلیقات میں ہمایوں کی بہادری اور اس کی مصیبتوں کا ذکر ہے۔

ہمایوں اور اکبر کے زمانے کے ہندی شعراء نے اگرچہ عشق کے متعلق بھی بہت کچھ لکھا ہے لیکن ان کی تصانیف کا بیشتر حصہ بھگتی سے متاثر ہوا، ان کی شاعری اس روشن سویرے کی مانند ہے جس میں رخصت ہونے والی شب کی نبضوں اور آنے والے دن کی دھڑکنیں شامل ہیں،

یہاں ہم شرنگار کال کے ان شعراء کی تخلیقات کا ذکر کریں گے جن کی شاعری میں بھگتی کال کے اثرات پائے جاتے ہیں، اور عشق سے متعلق ان کی تخلیقات بہت کم ہیں، ایسے شعراء میں سب سے پہلے اکبر کا نام آتا ہے،

اکبر کی منظومات اکبر شاہ یا ساہ اکبر کے تخلص سے ہندی کے مختلف قلمی اور مطبوعہ کشکولوں میں پائی جاتی ہیں، ان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ تانسین یا بیربل کی کہی ہوئی ہیں، لیکن بیربل اور تانسین کی شاعری کا رنگ اس سے بالکل مختلف ہے، اس لیے انھیں اکبر کا ہی نتیجہ فکر

تسلیم کرنا پڑے گا۔ اگر تانسین یا بیربل کو اکبر کے نام سے لکھنا ہی مقصود ہوتا تو وہ اپنی شاعری کا بہترین حصہ اکبر کے نام سے منسوب کرتے نہ کہ اوسط درجہ کی تخلیقات پر اس کے نام کی مہر لگا کر اس کے ذوق سلیم پر دھبہ لگاتے، اکبر کے نام سے منسوب ہندی منظومات بہت زیادہ معیاری تو نہیں تسلیم کی جا سکتیں لیکن انھیں سطحی بھی نہیں کہا جا سکتا۔ اس کا نمونۂ کلام یہ ہے:

ساہ اکبر ایک سمے چلے کانہ دنو د بلوکن بالہیں

آہٹ تیں ابلا نر کھیو چک چونک چلی کر آتر جالہیں

نیو بل بینی سدھار دھری سبھئی چھب یوں للنا ارلالہیں

چنپک چار دکمان چڑھاوت کام جیوں ہاتھ لیے آہ بالہیں

ٹوڈرمل | مہاراجہ ٹوڈرمل اکبر کے مشہور وزیر مال تھے، وہ پہلے شیر شاہ کے ملازم تھے، اس کے ہاں آراضیات اور دفاتر کا جو انتظام ٹوڈرمل نے کیا اس سے متاثر ہو کر اکبر نے انھیں اپنا معتمد بنا لیا، یہ ہندی کے اچھے شاعر تھے۔ ان کی منظومات زیادہ تر متفرق ہیں، اور کبتوں کی شکل میں پائی جاتی ہیں، انھوں نے بھگوت پران کا فارسی میں ترجمہ بھی کیا تھا، نمونۂ کلام یہ ہے۔

گن بن کمان جیسے گرو بن گان جیسے مان بن دان جیسے جل بن سُرمے

کنٹھ بن گیت جیسے ہیت بن پریت جیسے مین بن ریت جیسے پھل بن تُرُمے

تار بن جنتر جیسے سیانے بن منتر جیسے پرش بن نار جیسے پتر بن گھرمے

ٹوڈر سکو جیسے من میں بچار دیکھو دھرم بن دھن جیسے پنچھی بن پُرمے

ٹوڈرمل کی زبان سادہ، سلیس اور عام فہم ہے، اور ان کی شاعری میں زندگی کے بارے میں ان کے تجربوں کی ہی جھلک ملتی ہے۔

فیضی | فیضی عربی اور فارسی کے جید عالم ہونے کے ساتھ ہی سنسکرت اور ہندی کے بھی مایۂ ناز

پنڈت تھے، انھوں نے سنسکرت کی بہت سی کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا۔ ہندی شاعری کی حیثیت سے فیضی کو ابھی ہندی دنیا میں پوری طرح متعارف نہیں کرایا جا سکا ہے، راقم الحروف کو کتب خانۂ آصفیہ سے فیضی کا ہندی کلام دستیاب ہوا ہے، جس کی روشنی میں انھیں ایک کامیاب شاعر ماننا پڑتا ہے۔ بسنت سے متعلق شاعر کا ایک کبت ملاحظہ ہو ۔

کہوں کہوں تھور تھور بات گرے دو ڈھن تیں کہوں کہوں پاتن میں آئی بیرائی ہے

کہوں کہوں ساری بیری پاتن بلوکت ہیں کہوں کہوں جھرن کی جھرسی لگائی ہے

کہوں کہوں ٹھاڑھے درم دیکھیت دگمبر سے کہوں کہوں کواوڈ ادھر پائی ہے

فیضی یہ بس ہوں بیکھ بیکھہ پران ہاہا بیگ کھو بیر یہ کون مرت آئی ہے

(مخطوطات ۲۵۹۳ جدید کتب خانۂ آصفیہ حیدرآباد)

نرھری | نرھری کی پیدائش ۱۵۰۵ء میں رائے بریلی کے پکھرولی نامی گاؤں میں ہوئی تھی، بعد میں وہ ہانسی میں چلے آئے تھے، یہ ایک برہم بھٹ تھے۔ ان کی منظومات سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے فارسی اور سنسکرت کی تعلیم بھی حاصل کی تھی اور ہندی تو ان کی مادری زبان ہی تھی، انکی تصانیف میں رکمنی منگل، چھپے نیت اور کبت سنگرہ مشہور ہیں، ان میں رکمنی منگل شائع بھی ہو چکا ہے۔ نرھری کی شاعری میں بھگتی کا بڑا اثر ہے، اخلاقیات سے متعلق ان کا کلام لائق ستائش ہے، ان کا انداز بیانیہ نہیں بلکہ تاثراتی ہے۔ شاعر کا نمونۂ کلام یہ ہے:

کرت بنود سیام سیاما سنگھ دوادمن مدت روپ گن بھاجن

انگ انگ پرت رنگ منہ چھب اُتم گھن ببند و براجن

نرھری یہ بیریت سرت رت رادھے چرن اچپت ات لاجن

اچھر اچھر بینی پرت پیٹھ پرمارت منہومن متھ تاجن

بیربل راجہ بیربل کا اصل نام مہیش داس تھا، شہنشاہ اکبر نے انھیں "ویرور" کا خطاب دیا تھا، جو آگے چل کر بیربل ہوگیا، ہندی شاعری میں بیربل کا تخلص برہم تھا، کہیں کہیں "برمبھ" بھی ملتا ہے جو لفظ برہم کی بگڑی ہوئی شکل ہے، بدایونی نے ان کا نام منتخب التواریخ میں برہم دت لکھا ہے، یہ ذات کے برہمن تھے، ان کی جائے پیدائش تکوان پور (کالپی) بتایا جاتا ہے، اور سنہ ولادت ۱۵۲۸ء تسلیم کیا جاتا ہے، اب تک ان کے کلام کے محض متفرق چھند مل سکے ہیں، ان کے یہاں زیادہ تر گھنا کچھری اور سویا چھند پائے جاتے ہیں، زبان سادہ، رواں اور عام فہم ہے، ان کی منظومات عشق اور بھگتی کا خوبصورت سنگم ہیں، حمد باری تعالیٰ میں ان کا ایک کبت یہ ہے:

جو تم چھتر کی چھانہ چلدت تو نہ کہوں کچھو میں بدھ پائی
جو تم دھرا دھر بھیکھ منگا وت تو نہ کہوں کچھو آپ دیائی
برہم بھنے بنتی اتنی ہوں چھوروں نہیں ہری تو سرنائی
دین دیال دیا کر ما دھو موہ کہاں سب تو ہہ بڑائی

ذیل کے چھند میں سیج سے اٹھ کر انگڑائی لینے والی دوشیزہ کی خوبصورت تصویر بھی دیکھنے قابل ہے۔

سیج تیں ٹھاڑھی بھیئی اٹھ بال لئی الٹی انگڑائی جمہائی
رودم کی راجی براجی بسال متی ترلی اروبیٹھ کھلائی
بینی پری پگ اوپر پاچھے تے برہم بہے اپما اُر آئی
لوک ترلوک کے جیتبے کارن سونے کی کام کمان چڑھائی

تان سین تان سین کی پیدائش ۱۵۳۲ء میں وے ہٹ نامی گاؤں میں بتائی جاتی ہے، ان کا نام ترلوچن مصرا در ان کے والد کا مکرند پانڈے تھا، دو سو باون وشنوؤں کی وارتا میں انھیں ٹری ذات والا یعنی برہمن بتایا گیا ہے، ابتدائی تعلیم مشہور صوفی غوث محمد کے یہاں ہوئی، سنگیت میں ان کے استاد سوامی ہری داس تھے، ابوالفضل نے ان کی تعریف میں لکھا ہے کہ ایسا موسیقار ہزار برس پہلے تک نہیں پیدا ہوا تھا، آگے چل کر یہ مسلمان ہوگئے،، ان کی تصانیف میں سنگیت سار، راگ مالا اور سری گنیش استوتر ہیں، نمونۂ کلام یہ ہے،

آج بجائی مرلی منوہر سُدھ نہ رہی کچھو تن میں
ہوں یمنا جل بھرن جات ہی کانہ ٹھاڑھے برندابن میں
سدھ نہ رہی کچھو ٹھگن کی اگن میں بھولی کام کاج سب بھرن میں
تان سین کے پربھو تم بہو ایک میرو من موہیو الی مدن میں

تان سین نے ائمۂ اثنا عشریہ اور اولیاء کرام کی تعریف میں بھی کئی ایک چھند نظم کیے ہیں، اس طرح کا ایک چھند یہ ہے:

حضرت علیؓ کی سود شٹ بھلی مو پر جو دکھ جائے سب تن تے بھاج
ہوں سیوک نہار و تم جان پاک کریم کرم کیجئے رکھ لیجئے جگت میں لاج
بچن بنیج گن دے ہمے دے نمن پاک جگت مریاج نیاج
تان سین رحمان کریم رحیم بنتی سنیے آواج

گنگ اکبر کے درباری شعراء میں گنگ کو اہم مقام حاصل ہے، ان کی پیدائش ۱۵۳۸ء میں اٹاوہ ضلع کے اکنور نامی گاؤں میں ہوئی، یہ ذات کے بھٹ برہمن تھے، عبدالرحیم خانخانان ان سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ انھوں نے ان کے ایک چھپے پر خوش ہوکر انھیں ۳۶ لاکھ روپئے انعام دیے تھے، وہ چھپہ یہ ہے:

چکت بھنود رہی گیو گمن انہ کرت کمل بن

او پھن من نہ لیت تیج نہ بہت یون گھن

ہنس مانسر تجیو چکت چکّی نہ ملے ات

بہو سندر پدمنی پرش نہ چہیں نہ کریں رت

کھل لت سیس کو گنگ من امت تیج دد تا کھیو

کھانان کھاں بیرم شوَن جب ہی کرودھ کر تنگ کیو

شو سنگھ سینگر نے لکھا ہے کہ گنگ کے اس چھپے پر بیربل نے بھی انھیں ایک لاکھ کے انعام سے نوازا تھا، جس کے شکرانے میں گنگ نے بیربل کی شان میں کئی پد نظم کیے تھے۔

گنگ جہانگیر کے دور تک زندہ رہے، ان کی زندگی کے آخری سال اچھے نہیں گذرے، کہا جاتا ہے کہ انھیں کسی جرم میں ہاتھی سے کچلوا کر سزائے موت دی گئی تھی، لیکن اس سلسلہ میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

گنگ کی تصانیف میں "گنگ پداولی"، "گنگ پچیسی" اور "گنگ رتناولی" کے نام لیے جاتے ہیں، گنگ کے پدوں میں بھی بھکتی اور شرنگار دونوں کی جھلک ملتی ہے، شرنگاری ادب میں شاعر نے وصل اور ہجر کی بڑی موثر اور اچھی تصویریں پیش کی ہیں، نمونۂ کلام یہ ہے:-

گنجت کنج مدھو برت پنج سروج کے سوربھ کی سرسائی

گنگ سو بران ہی کو پیان بھروں کر بجانت بیوگ دسائی

کوکل بولت باگ ہی باگ بسنت کے وا سر سون نہ بائی

جیت کی جاندنی کے چیتئے تن کیسے کے چھانڑ گو کام کسائی

رحیم | اکبری دور کے ہندی شعرا میں رحیم وہ خوش قسمت شاعر ہیں جن کی زندگی سے

متعلق تمام تفصیلات تاریخوں میں محفوظ ہیں۔ بیرم خاں خانخاناں کا یہ نور نگاہ ایک بلند شاعر، ایک عظیم انسان اور ایک بڑا مفکر تھا، اس کا سنہ ولادت متفقہ طور پر ۱۵۵۶ء تسلیم کیا جاتا ہے۔

رحیم نے ابتدا ہی سے عربی، فارسی، ترکی، سنسکرت اور ہندی وغیرہ زبانوں کی تعلیم حاصل کی تھی، اور ان سب زبانوں میں اچھی دستگاہ رکھتے تھے، ان کی علم دوستی اور شعرا نوازی کے تذکرے آج بھی مشہور ہیں۔

ہندی شاعری میں خان خاناں کا تخلص رحیم تھا، ان کے دوہوں میں اخلاقیات کے بڑے بلند نمونے پائے جاتے ہیں، مصر بندھوؤں نے خانخاناں کے علاوہ ایک اور رحیم نامی شاعر کا ذکر کیا ہے، اور ذیل کے پد کو ان کے نام سے نقل کیا ہے۔

سنیے وٹپ پر بھو پُہپ تہارے ہم راکھو ہمیں سو بجار اوری بڑھائی ہیں

تجھو ہر کھ کے تو دلگ نہ سوچے کچھو جہاں جہاں جیسے تس دونوں جرگائی ہیں

سرن چڑھینگے نر سرن چڑھینگے پر شکو رحیم ہاتھ ہاتھ میں بکائی ہیں

دیس میں رہینگے پردیس میں رہینگے کا ہو بھیس میں رہینگے تو راوری کہائی ہیں

لیکن درحقیقت یہ چھند امیس نامی کسی مسلمان شاعر کا ہے، جس کی تائید شو سنگھ سروج کے بیان سے ہوتی ہے، کچھ لوگوں نے اس پد کو مشہور مرثیہ نگار میر انیس سے بھی منسوب کیا ہے، لیکن یہ بالکل بے بنیاد خیال ہے، رحیم کی تصانیف میں رحیم دوہاولی، بروے نائیکا بھید، شرنگار سورٹھا، مدنا شٹک، راس پنچا دھیائی اور نگر شوبھا وغیرہ کے نام لیے جاتے ہیں۔

رحیم نے شرنگار رس میں ہجر کے جیسے اثر انگیز مناظر پیش کیے ہیں، وہ قاری کے دل و دماغ پر گہرے نقوش چھوڑ جاتے ہیں، رحیم کا بروے نائیکا بھید ان سے بھرا ہوا ہے، کبھی مجبور نائیکا کسی مسافر سے اپنا پریم سندیش لے جانے کی خواہش کرتی نظر آتی ہے، کبھی ساون کے

امنڈتے ہوئے بادلوں میں چمکتی ہوئی بجلی کو دیکھکر اسے اپنی تنہائی کا احساس بے چین کر دیتا ہے، وہ تمام مناظر جہاں وہ اپنے محبوب کے ساتھ عشق و محبت کی اٹکھیلیاں کیا کرتی تھی، اسے کاٹ کھانے کے لیے دوڑ رہے ہیں، من موہن کی جدائی سے اس کی جان آنکھوں میں آکر ٹھہر گئی ہے، اور وہ دن رات آنکھیں بچھائے ہوئے اپنے پریتم کی منتظر رہتی ہے، اس کی تمام سکھیاں اپنے اپنے شوہروں کے ساتھ پھاگ کھیل رہی ہیں لیکن وہ اس امید میں کہ شاید آج اس کا محبوب آجائے دن رات کوّے اڑاتی رہتی ہے۔

رحیم نے مناظر فطرت کی بھی بڑی خوبصورت عکاسی کی ہے، اس قسم کے چھندوں میں اخلاقیات کی جھلک بھی نظر آتی ہے، ذیل میں شاعر کے دو دوہے نقل کیے جاتے ہیں:

مان سرود رہی ملے ہنس مکتا بھوگ — سپھرن بھرے رحیم سر وک بالک نہ جوگ

داد رمور کسان من لگیو رہے گھن مانھ — رحمن جاتک رٹن ہوں سرور کو او ناتھ

اخلاقیات اور فلسفۂ زندگی سے متعلق رحیم کے دوہے عوام میں بہت مقبول ہیں اور اس قدر کے اکثر دوہے ان کی زبان پر رہتے ہیں، اس طرح کے کچھ دوہے ملاحظہ ہوں۔

رحمن اتی نہ کیجئے گر رہئے نج کان — سیجن ات پھولے تو ڈار پات کی ہان

رحمن پریت نہ کیجئے جس کھیرا نے کین — اوپر سے تو دل ملا بھیتر پھانکے تین

رحمن تب لگ ٹھہرئیے دان مان سنمان — گھٹت مان دیکھیہ جبھی ترت ہی کریہ پیان

جیوں رحیم گت دیپ کی کل کپوت گت سوئی — بارے اجیار لگے بڑھے اندھیر و ہوئی

عالم عالم اکبر کے عہد کے ایک مشہور ہندی شاعر ہیں، ان کے عشقیہ کبت ہندی حلقہ میں کافی مقبول ہیں۔ ان کی پیدائش ایک برہمن گھرانے میں ہوئی تھی، آگے چل کر یہ مسلمان ہوگئے تھے، ان کے بارے میں مشہور ہے کہ ان کے پڑوس میں ایک رنگریز کی لڑکی رہتی تھی، جو ان کی دھوتی وغیرہ رنگتی تھی، ایک مرتبہ انھوں نے اس کو اپنی دھوتی رنگنے کے لیے دی، اس کے ساتھ اس میں

بندھا ہوا ایک نامکمل دوہا بھی چلا گیا جس میں شاعر صرف یہ مصرع نظم کر سکا تھا،

کنک کام سی کامنی کا ہے کو کٹ چھین

رنگریز کی لڑکی نے جب دھوتی رنگ کر واپس کی تو اس کے ساتھ دوہے کو مکمل کرکے بھیجدیا، دوسرا مصرع اسقدر خوبصورت اور پرمعنی تھا کہ شاعر بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا، وہ مصرع یہ ہے

کٹ کو کنچن کاٹ بدھ کچن مدھیہ دھر دین

یعنی دوشیزہ کی کمر اس لیے پتلی ہے کہ اس مقام کا سونا نکال کر خالق نے اس کے سینہ میں رکھدیا ہے، اس مصرعہ نے شاعر کے قلب پر محبت کے ایسے نقوش ابھارے کہ دونوں رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوگئے، نمونۂ کلام یہ ہے:

جا تھل کینے بہار انیکن تا تھل کانکری بیٹھی چینو کریں

جا رسنان سوں کری ہو باتن تا رسنان سوں چرتر گینو کریں

عالم جون کے کنجن میں کری کیل تہاں اب سیس دھینو کریں

نینن میں جو سدا رہتے تنکی اب کان کہانی سنیو کریں

سیناپتی سیناپتی گنگا دھر دکچھت کے بیٹے تھے، یہ ہیرامن دکچھت کے شاگرد تھے، جو اپنے زمانے کے بڑے عالم تسلیم کیے جاتے تھے، سیناپتی نے کبت رتناکر نام کا ایک گرنتھ لکھا تھا، صنایع اور بدایع کے ساتھ زبان کی چاشنی اور اس کی لذت سیناپتی کے کلام کی خصوصیات ہیں، یوں تو شاعر نے شر نگار اور بھگتی سے متعلق بہت سے کبت نظم کیے ہیں لیکن فطری مناظر کی جتنی خوبصورت عکاسی ان کے یہاں پائی جاتی ہے وہ انہی کا حصہ ہے۔ موسم برسات کی ایک خوبصورت تصویر ملاحظہ ہو۔

گگن انگن گھن گھات تیں سگھن تم سیناپتی نیک ہو نہ نین اٹکت ہیں

دیپک کی دمک دیگنان کی جھمک چھانڑ چپلا چمک اور سو نہ اٹکت ہیں

اب گیو دب مانو سس سوادگھس گیو تاے توڑا رے سو نہ کہوں چٹکت ہیں

مانو بھا مرتے بھول پری باٹ تاتیں رد سس تاے کہوں بھولے بھٹکت ہیں

کبت رتناکر کا سنہ تصنیف ۱۶۴۹ء بتایا جاتا ہے، یہ وہ زمانہ تھا جب شرنگار کال کی شفق ہندی شاعری کے آسمان پر پھوٹ رہی تھی، اور جس نے عوام کے ذوق اور رجحان کو ایک نئے دھارے کی طرف موڑ دیا تھا،

شرنگار کال کے عظیم ہندی شعرا زمانۂ شرنگار کے عظیم ہندی شعرا میں کیشو، بہاری، چنتامن، دیو، متِرام، رسلین اور مدھنایک کے نام لیے جاتے ہیں، ان شعرا کے علاوہ بھوشن، گھنانند، بھکھاری داس، پدماکر، گوپ، شری ہر، رسک سمت، رگھوناتھ، گوبند، دولہہ، رس روپ، سندر، توش، جینی پروین، بیرت مصر، رحمت، جان، شری پت، پرتاب ساہ اور مبارک کی شاعری سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا، ان شعرا سے ہندی ادب کی تاریخ کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے جسے ہندی کے بعض محققین نے ریت کال بھی کہا ہے اور جو راقم الحروف کے نزدیک شرنگار کال ہے۔

مغلیہ دربار کی سرپرستی اور حکومت کی ادب نوازی ہندی شاعری کے طرز میں بنیادی تبدیلیوں کا پیش خیمہ ثابت ہوئی، اور تہذیبی اختلاط کا ایک ایسا دور شروع ہوا جو اس سے قبل محض ایک خواب تھا، روحانی تصورات کی دلفریبی مادی شان و شکوہ کے سامنے ماند پڑنے لگی، اور محبت اور عشق سرمدی کا تصور آہستہ آہستہ عشق مجازی کے روپ میں ڈھلنے لگا، کرشن اور رادھا مخصوص مادی پیکر نہ ہوتے ہوئے بھی دنیائے عشق کے دو علمبردار بن گئے، جنھیں عقیدت، جذباتی خلوص اور مذہبی لگن کی حدوں میں قید نہیں کیا جا سکا،

شاعری جب پیغمبری کے درجہ کو نہیں پہنچتی تو صنعت گری بن جاتی ہے، اس لیے ہندی شاعری کا یہ دور قواعد و صنعت کاری کا دور بن گیا، اس دور نے پہلی بار ہندی شاعری کو مذہبی دائرہ

سے نکال کر ادبی پیرایۂ بیان بخشا، اس کے قواعد مرتب اور صنائع و بدائع وضع کیے، اس کے اصول و ضوابط مکمل کیے اور زبان کے استحکام کے سلسلہ میں بہت کچھ کام کیا، لیکن ان کا کارنامہ شعری نہیں لسانی ہے،

کیشو داس کیشو داس کے بارے میں بھکتی کال کے شعرا کے تذکرہ میں لکھا جا چکا ہے، یہاں انکی صنعت کاری پر کچھ روشنی ڈالی جائے گی، کیشو داس نے بھاما، زندگی اور حنٹ وغیرہ قدیم النکار شاستر کے اچاریوں کی تقلید کی، کیشو کی تصانیف رسک پریا اور کوی پریا ان کے بعد کے اچاریوں کے لیے مشعل راہ ثابت ہوئیں، کیشو کی ان تصانیف کا مقصد ہندی زبان کے ذریعہ کابیہ شاستر جیسے دقیق موضوع کو عام فہم بنانا تھا، چنانچہ ایک مقام پر وہ رقم طراز ہیں:

سمجھے بالا بالکھوں ورڈن پنتھ اگادھ کوی پریا کیشو کری چھمیو کوی اپرادھ

کوی پریا اور رسک پریا دونوں میں شاستریہ مسائل پر گہرے افکار پیش کیے گئے ہیں، الفاظ پر کیشو داس کو عبور حاصل تھا، ان کے نزدیک انداز بیان کی سادگی صحیح معنوں میں شاعری نہیں تھی، بلکہ وہ صنعت کاری کو خاص اہمیت دیتے تھے، ان کا خیال تھا،

بھوشن بنا نہ سوھی کبت بنتا مت

ان کا نظریہ ہے کہ ماہتاب اور نیلوفر حقیقۃً اتنے خوبصورت نہیں جتنا ایک شاعر کا تخیل ان کو خوبصورت بنا دیتا ہے۔

دیکھے مکھ بھادے ان دیکھے ہی کمل چند

کوی پریا کوی پریا میں کیشو نے شاعری کی فنی باتیں درج کی ہیں، یہ ۱۶ فصلوں پر مشتمل ہے، اس میں خاص طور پر جن باتوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ یہ ہیں، کابیہ دوش یعنی شاعری کے نقائص اور خامیاں، کوی بھید یعنی اقسام شعرا ورٹن کے پرکار یعنی اسلوب بیان، سامانیا النکار

یعنی صنعت عمومی دشٹنٹ النکار صنعت خصوصی وغیرہ۔ نکھ شکھ ورنن، اس میں سراپا معشوق کا بیان ہے۔

رسک پریا | رسک پریا کا مقصد کوی پریا سے مختلف ہے۔ کوی پریا کا مقصد عوام تک کاویہ شاستر کی تعلیمات پہونچانا ہے اور رسک پریا تعلیم یافتہ طبقہ کے لیے لکھی گئی ہے کیشو نے صاف لفظوں میں کہا ہے ؎

اَتِ رتِ گتِ مَتِ ایک کر بیدھ بیبیک بلاس — رسکن ہیت رسک پریا کینی کیشوداس

رسک پریا کی پہلی فصل میں نورسوں کے نام اور ان سب میں شرنگار پر خاص طور پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ دوسری فصل میں نایک اور نائیکاؤں کی قسمیں اور انکی تعریف ہے، یہ سلسلہ پانچویں فصل تک چلتا ہے، چھٹی فصل میں معشوق کی اداؤں (ہاؤبھاؤ) کا بیان ہے، اس کے بعد ویوگ کی مختلف کیفیتوں کا تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے، بارھویں اور تیرھویں فصلوں میں سہیلی اور اس کی معروفیات کا بیان ہے، چودھویں فصل میں شرنگار کے علاوہ دیگر مرسوں کا بیان ہے، پندرھویں فصل میں ورتی اور سولھویں فصل میں رس دوشوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

کیشو کے بعد النکار کے مشہور آچاریوں میں جسونت سنگھ، مت رام اور شوراج بھوشن ہیں۔

بہاری | بہاری کا شمار ہندی کے صف اول کے شعرا میں کیا جاتا ہے، ان کی شہرت اور مقبولیت کا سہرا ان کی تصنیف بہاری ست سئی پر ہے، ست سئی سات سو اشعار پر مشتمل تصنیف کو کہتے ہیں، سنسکرت اور ہندی کے ست سئی ادب میں بہاری ست سئی کا درجہ سب سے بلند مانا جاتا ہے، یہ کتاب مہاراجہ جے شاہ کے حکم پر لکھی گئی تھی، جیسا کہ خود شاعر نے کہا ہے

حکم پائے جے شاہ کو ہری رادھکا پرساد — کری بہاری ست سئی بھری انیک سواد

بہاری کی ست سئی کو بجا طور پر شعریت اور عاشقانہ کیف و مستی کی معراج قرار دیا جا سکتا ہے،

بہاری کی شاعری پڑھنے والے کو ایک ایسے ماحول میں لاکر کھڑا کر دیتی ہے جہاں زندگی شاداب و سرمست نظر آتی ہے، شاعر نہ الفاظ کی شعبدہ بازی کا احساس ہونے دیتا ہے اور نہ ذہنی ماورائیت میں کھو جانے کی دعوت دیتا ہے، اور نہ ایک فلسفی و محقق یا عالم کی حیثیت سے اپنا تعارف کراتا ہے، بلکہ ایک عام انسان کی طرح عشق و محبت کا راگ چھیڑ کر اس کے ابدی نقش چھوڑ جاتا ہے، صنعت گری کا یہ بادشاہ اور انبساط کا یہ تاجر دلوں کو اپنے کلام کے بدلے میں خرید لینا چاہتا ہے، اقسام نسواں کا دقیق مطالعہ کرنے والا ماہر عورت و مرد کے جنسی اور نفسیاتی تعلقات کی بڑی ہی خوبصورت تصویریں پیش کرتا ہے، اس کے باوجود اس کا کلام فحاشی سے پاک ہے، اس کی شاعری داخلی جذبہ اور روحانی کیفیت کا مجموعہ ہے، جس پر صناعی کا گہرا پردہ پڑا ہوا ہے۔

بہاری کی پیدائش گوالیار کے قریب بسوا گوبند پور گاؤں میں ہوئی، بعض محققین کا خیال ہے کہ اس کا سنہ پیدائش ۱۵۱۵ء ہے، اس سلسلہ میں یہ دوہا نقل کیا جاتا ہے۔

سنون جگ مہر س مہت بھوم ریت جن لیکھ — کاتک سدبدھ اشٹمی جنم ہمہیں بدھ دیکھ

لیکن یہ دوہا ست سئی کے مستند نسخوں میں نہیں پایا جاتا، اور کسی شرح نگار کا نتیجۂ فکر معلوم ہوتا ہے، اس کا سنہ پیدائش ۱۵۹۵ء کے قریب تسلیم کیا جاتا ہے، بہاری کے والد کا نام کیشو رائے تھا، جسے کچھ لوگوں نے ہندی کا مشہور شاعر کیشوداس سمجھ لیا ہے، جو صحیح نہیں ہے، کیشو رائے شاعر ضرور تھے، لیکن کیشوداس اور کیشو رائے کو ایک سمجھنا غلط ہے، ان کے والد انھیں آٹھ برس کی عمر میں لیکر گوالیار سے اوڑچھا چلے گئے، وہاں انھوں نے کیشوداس کے گرنتھوں کا مطالعہ کیا، اوڑچھا کے قریب گڑھو نامی گاؤں میں نمبارک مسلک کے مہاتما نرہرداس رہتے تھے، بہاری نے ان سے سنسکرت اور پراکرت کی تعلیم حاصل کی